روشنی کا راز



روشنی کا راز





طارق اسمٰعیل ساگر

(۲)

کیپٹن علی، عامر اور ٹیپو کے کارنامے

روشنی کا راز

طارق اسمٰعیل ساگر



فیروز سنز لمیٹڈ
لاہور - راولپنڈی - کراچی

ٹا اں.....گو

پیٹرک بڑا سخت جان ثابت ہُوا۔ کیا مجال جو کسی بھی قسم کے تشدد یا سختی کے سامنے اُس نے ہتھیار ڈال کر زبان کھولی ہو۔ بڑے بڑے ماہر تفتیش اُس کے سامنے بے بس نظر آ رہے تھے۔ پولیس نے اس پُراسرار کیمیکل پاؤڈر کا راز اُگلوانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا تھا لیکن پیٹرک ٹس سے مَس نہیں ہُوا تھا۔

"مجھے سمجھ نہیں آتی کہ آخر یہ شخص کس چیز سے بنا ہُوا ہے" آئی جی آفریدی صاحب نے جو اس وقت کیپٹن علی کے پاس بیٹھے پیٹرک کے متعلق بتا رہے تھے، بالآخر کہا۔

"آپ نے اُس کی تفتیش کی ذمّے داری کس کے سپرد کی ہے؟" کیپٹن علی نے کچھ سوچتے ہوئے اُن سے دریافت کیا۔

سُراغ رسانی اور تفتیش کا جو خصوصی سیل قائم کیا گیا ہے، میں نے خاص طور سے یہ ذمّے داری اُن لوگوں کو سونپی تھی۔ لیکن یہ شخص تو کسی طرح کی مارپیٹ یا تشدد کا اثر ہی قبول کرنے کے لیے

تیار نہیں ہوتا۔ خُدا جانے اُس کا جسم کس چیز سے بنا ہے کہ جس پر کوئی چوٹ اثر انداز ہی نہیں ہو رہی۔ حیرانگی تو اِس بات کی ہے کہ کسی بھی قسم کی ضرب لگنے پر اُس کے مُنھ سے کوئی آواز بھی نہیں نکلتی! بالکل یوُں لگتا ہے جیسے اُسے کوئی سانپ سُونگھ گیا ہو" آفریدی صاحب نے وضاحت کی۔

عامر اور ٹیپو بھی اُن کے نزدیک بیٹھے بڑے غور سے یہ گفتگو سُن رہے تھے۔

"میرے ذہن میں ایک بات آتی ہے جناب" عامر نے کچھ سوچتے ہُوئے کہا۔

"کیا؟" سب کے مُنھ سے ایک ساتھ نِکلا تھا۔

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ اُس نے جِسم کو بے حِس کرنے والی کوئی دوائی نِگل رکھی ہو۔ جس شخص کے قبضے سے ایسا خطرناک کیمیکل پاؤڈر برآمد ہُوا ہے اُس سے کسی بھی بات کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اور یہ بات بھی ہمارے ذہن میں رہنی چاہیے کہ وہ کسی عام مجرم قسم کے گروہ سے تعلّق نہیں رکھتا۔ یہ بڑے تربیت یافتہ لوگ ہیں" عامر نے اپنی بات ختم کرتے ہُوئے کہا۔

"شاباش میرے مٹی کے شیر۔ کبھی کبھی تو تم واقعی کمال کر دیتے ہو" علی نے اُسے داد دی۔

"جی ہاں۔ کبھی کبھی اِن سے ایسی غلطی ہو ہی جاتی ہے

جس کے لیے پھر شرمندہ نہ ہونا پڑے" ٹیپو نے کہا۔

"ویسے میری کوشش بھی ہوتی ہے کہ ایسی غلطیاں ہوتی ہی رہا کریں تاکہ آپ کو میرے متعلق جو غلط فہمی ہے وہ کم از کم دُور ہو جائے" عامر نے کہا۔

"یہ کیا غلطیوں کی گردان شروع کر دی ہے؟ اچھا بھئی، اب رُوٹھ نہ جانا۔ تم واقعی بہُت ذہین بچے ہو" علی نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"مُجھے اپنے متعلق ایسی کوئی غلط فہمی نہیں ہے جناب" عامر نے تُنک کر بولا۔

"میرا خیال ہے اب کوئی کام کی بات بھی ہو جائے" کیپٹن علی نے کہا۔

"ضرور کیجیے۔ آرام تو آپ نے ہم پر حرام کر ہی دیا ہے۔ اب تو بس کام ہی کام ہے۔ سو ہم کر ہی رہے ہیں" عامر نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

وہ اور ٹیپو اس وقت ایک مقامی سرکس کا شو دیکھنے جا رہے تھے۔ جس کے لیے انھوں نے اگلے ہی روز ٹکٹ بُک کروا لیے تھے۔ عین وقت پر آئی جی مسٹر آفریدی اس مسئلے سمیت اُن کے پاس پہنچ گئے اور اب انھیں بادل نخواستہ اپنا پروگرام منسوخ کرنا پڑا تھا۔

"ایک تو تم نے آج کل نہ جانے بات بات پر رونا کیوں شروع کر دیا ہے" کیپٹن علی نے اس کو چھیڑنے کے انداز میں کہا۔

"آپ کی صحبت کا اثر ہے جناب، ورنہ میری کیا مجال" عامر نے برجستہ جواب دیا۔

"یار، میری صحبت کا کوئی اچھا اثر بھی قبول کر لیا کرو" علی بولا۔

"جی ہاں۔ یہ اس اچھے اثر کی وجہ ہی ہے آج کل ہماری نیندیں اور تفریح بھی آپ کے قبضۂ قدرت میں چلی گئی ہے۔ زندگی میں اول تو تفریح کا موقعہ ہی نہیں آتا۔ اگر آ بھی جائے تو عین وقت پر کوئی کام آن پڑتا ہے۔"

"دراصل آپ کو حالات کی نظر لگ جاتی ہے" آئی جی صاحب نے ان کی گفتگو سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مداخلت کی۔

"بھئی کسی نہ کسی کو تو کام کرنا ہی ہے۔ اگر ہم بھی آرام کے چکر میں پڑ گئے تو پھر سب گئے کام سے" کیپٹن علی نے ہنستے ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ ہوئی نہ کام کی بات" آئی جی صاحب ہنس دیے۔

تھوڑی دیر تک اس معاملے کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد وہ اُٹھ کر چلے گئے۔

تینوں حوالات کی طرف جا رہے تھے۔ جہاں پیٹرک کو قید

رکھا گیا تھا۔

ان کی شکل پر نظر پڑتے ہی انچارج انسپکٹر نے سلیوٹ مار کر انھیں احترام دیا۔ گاڑی سے اُتر کر وہ انسپکٹر کی معیت میں اس سیل کی طرف چل دیے جہاں پیٹرک کو قید رکھا گیا تھا۔ راستے میں انسپکٹر انھیں بتاتا جا رہا تھا کہ یہ بڑا سخت جان مُلزم ہے اور "تھرڈ ڈگری" کا ہر حربہ اس پر استعمال کیا جا چکا ہے مگر کیا مجال کہ وہ ایک لفظ بھی بولنے کے لیے تیار ہو۔

چند منٹ بعد تینوں اُس کوٹھری کے سامنے کھڑے تھے جہاں پیٹرک دیوار سے لگ کر دروازے کی طرف مُنھ کیے بیٹھا تھا۔ اِنھیں اپنی طرف آتے دیکھ کر اُس نے اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کی تھی۔

"تم کچھ نہیں بتاؤ گے؟" کیپٹن علی نے دروازے کی سلاخوں کے نزدیک پہنچ کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔ آپ کون لوگ ہیں؟ مجھے کیوں پکڑ لائے ہیں؟ میں کسی کو نہیں جانتا۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا میرے گھر سے کچھ برآمد نہیں ہوا۔ آخر آپ لوگ میرے ساتھ زیادتی کرنے پر کیوں تُلے ہوتے ہیں" پیٹرک نے اس طرح لاپرواہی سے کہا جیسے ناک سے مکھی اڑا رہا ہو۔

"دیکھو، زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو۔ ہیبت خان

گرفتار ہو چکا ہے۔ اُس نے ہمیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ تمہارے خلاف اتنے ثبوت ہمیں مل چکے ہیں کہ تم ساری زندگی جیل میں سڑتے رہو گے۔" علی نے اُس پر اپنی دانست میں بڑا نفسیاتی حملہ کیا تھا لیکن پیٹرک کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ کیا مجال جو اُس کے چہرے کا رنگ ذرا بھی تبدیل ہُوا ہو۔

"اوّل تو میں کسی ہیبت خاں نام کے آدمی کو جانتا ہی نہیں۔ پھر مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ اگر آپ کو اُس نے میرے متعلق سب کچھ بتا دیا ہے تو آپ نے یہاں آنے کی زحمت ہی کیوں کی ہے۔ اگر کوئی ایسی بات آپ جاننا چاہتے ہیں تو پھر اُسی سے پوچھ لیجیے۔ مجھے کیوں مُصیبت میں ڈال رکھا ہے" اُس نے بڑے طنزیہ لہجے میں کہا "یہ بے چارے الگ پریشان ہو رہے ہیں" اُس نے علی کے نزدیک کھڑے انسپکٹر کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا۔

"اِس کا مطلب ہے کہ گھی سیدھی اُنگلیوں نہیں نکلے گا" کیپٹن علی بولا۔

"گھی کہاں جناب، یہاں تو سر میں لگانے کے لیے تیل نہیں ملتا۔ میرے سر کی حالت آپ دیکھ رہے ہیں۔ ان لوگوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے" اُس نے دوبارہ علی کا تمسخر اُڑایا۔

"تم بہت چالاک بنتے ہو لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ میں اپنی تفتیش کا آغاز اُس وقت کروں گا جب اس دوا کا اثر ختم ہو جائے گا جو تم نے نگل رکھی ہے" کیپٹن علی نے گو کہ ہوا میں تیر چلایا تھا لیکن عین نشانے پر لگا۔ دوا کا لفظ اُس کے مُنہ سے ادا ہوتے ہی پیٹرک کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

"کیا مطلب؟ کس دوائی کی بات آپ کر رہے ہیں جناب؟ میں نے کہا تھا کہ یہاں تو سر پر لگانے کے لیے تیل نہیں ملتا" پیٹرک نے سنبھلنے کے لیے دوبارہ علی پر طنز کی جو بڑے تحمل سے اُس کی گفتگو سُن رہا تھا۔ لیکن عامر کو تو غصّہ آ گیا۔

"زیادہ بڑھ چڑھ کر باتیں نہ کرو۔ ہم اُس دوا کی بات کر رہے ہیں جو تم نے اپنے جسم کو وقتی طور پر بے حس کرنے کے لیے نگل رکھی ہے اور جس کا نشہ دو یا تین روز بعد اُتر جائے گا۔ تم بہت مکّار بننے لگے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ جب تین چار روز تک پولیس تمھیں مار مار کر تنگ آ جائے گی تو اُسے یقین آ جائے گا کہ تم واقعی بے گناہ ہو اور غلطی سے پکڑے گئے ہو۔ لیکن یاد رکھو، ہم اس دوا کا اثر ابھی ختم کر دیں گے اور اپنی تفتیش کا آغاز تم پر اُبلتا ہُوا تیل پھینک کر کریں گے۔ اسے سر میں لگا لینا یا پھر سر کو اُس میں ڈبو لینا۔

اس طرح تمھاری یہ شکایت بھی تمھارے ساتھ ہی ختم ہو جائے گی کہ تمھیں یہاں تیل نہیں ملتا۔ یاد رکھو ہم اپنے وطن کے دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کیا کرتے۔"

جوں جوں عامر بولتا جا رہا تھا اُس کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔ غصّے سے اُس کے چہرے کا رنگ سُرخ ہونے لگا تھا جبکہ پیٹرک کا چہرہ زرد پڑنے لگا تھا۔ یہ انکشاف ہی اُس کی جان نکال دینے کے لیے کافی تھا کہ ان لوگوں کو علم ہو چکا ہے کہ اُس نے مار کی اذیت سے بچنے کے لیے دوا استعمال کی ہے۔ اُسے اِس خیال ہی سے دہشت ہونے لگی تھی کہ جب نارمل ہونے پر اُسے اتنی مار برداشت کرنا پڑی تو اس کا کیا حال ہوگا؟ لہٰذا اُس نے چُپ چاپ ہتھیار ڈال دینے ہی میں بہتری سمجھی تھی۔

"آخر آپ لوگ چاہتے کیا ہیں؟ اُس نے بظاہر زچ ہو کر کہا۔

"ہم سچائی جاننا چاہتے ہیں۔ تمھارا ہیبت خاں کے گروہ سے کیا تعلق تھا؟ کیمیکل پاؤڈر کا راز کیا ہے؟ وہ تم تک کیسے پہنچا؟" کیپٹن علی نے کہا۔

"لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ سب کچھ بتا دینے کے بعد میں زندہ بھی رہ سکوں گا؟" اس مرتبہ پیٹرک کا لہجہ بالکل بدلا ہوا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمھارا؟" عامر نے کہا۔

"جناب، ہیبت خاں تو اُس طاقت کا ادنیٰ سا غلام ہے جس کا تعلق اس کیمیکل پاؤڈر سے ہے جو آپ نے میرے گھر سے برآمد کیا ہے۔ یہ تو اُس کا معمولی حربہ تھا۔ وہ طاقت ہیبت خاں کے ذریعے بچّوں کے اغوا کی وارداتیں اس لیے کروا رہی تھی کہ آپ کے مُلک میں خوف و ہراس پیدا کر سکے۔ اس طرح خوف و ہراس پیدا کر کے وہ اپنے گھناؤنے مقاصد کو بروئے کار لانا چاہتا ہے۔ دراصل آپ کے ملک کو تباہ کرنے کے منصوبے کا آغاز اس طرح کیا گیا ہے" پیٹرک نے کھڑے ہو کر سلاخوں کے نزدیک آکر بڑی رازداری سے کہا۔

"کون ہے وہ طاقت؟" کیپٹن علی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"دیکھیے۔ یہ جگہ بالکل غیر محفوظ ہے۔ آپ مجھے یہاں سے کہیں اور لے جائیے۔ میں آپ کو اپنی زندگی کی ضمانت پر سب کچھ بتا دُوں گا" پیٹرک نے بڑی خوف زدہ نظروں سے چاروں اطراف کا جائزہ لے کر کہا۔

"گھبراؤ نہیں۔ تم بالکل محفوظ ہو۔ یہاں کوئی تمھیں کچھ نہیں کہے گا۔ اگر تم ہمارے ساتھ تعاون کرو گے تو ہم تمھارے لیے ضرور کوئی راستہ نکال لیں گے" عامر نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"آپ نہیں سمجھ سکتے جناب، خدا کے لیے مجھے جلد از جلد یہاں سے نکال کر کہیں بھی لے جائیے۔ میں آپ سے زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔ یہ جگہ میرے لیے بالکل غیر محفوظ ہے" پیٹرک نے جو کل تک بڑا سخت جان ملزم ثابت ہو رہا تھا، سہمے ہوئے بچے کی طرح خوف زدہ نظروں سے سلاخوں کے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ بات کرتے ہوئے اس کے چہرے کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔

"اچھا، چلو۔ کہیں اور چلتے ہیں" کیپٹن علی نے گردن موڑ کر عامر کو آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

کیپٹن علی کے اشارے پر انسپکٹر نے ایک سپاہی کو آواز دی۔ جس نے حوالات کے دروازے پر پڑا تالا کھول دیا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو ہتھکڑی لگا کر باہر نکال لیا۔ اُس نے سپاہی کو کہا تھا کہ پیٹرک کو اُس کی گاڑی کی طرف لے جائے۔ علی کا خیال تھا کہ اگر پیٹرک یہاں کچھ نہیں بتانا چاہتا تو وہ اُسے اپنے ساتھ کسی محفوظ ٹھکانے پر لے جائیں گے جہاں جا کر وہ شاید زیادہ اطمینان سے گفتگو کر سکے۔

سپاہی اور پیٹرک آگے آگے چل رہے تھے۔ سپاہی نے اُس کی ہتھکڑی اپنے ہاتھ ہی میں پکڑ رکھی تھی۔ علی اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ انسپکٹر کو کچھ ہدایات دینے کے بعد اُن کے

تعاقب میں آ رہا تھا۔ جب اچانک اُس نے پیٹرک کو لڑکھڑا کر گرتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی سائیں کی آواز پیدا کرتی ہوئی ایک گولی اُس کے کان کے نزدیک سے گزر گئی۔

اُس نے میبو کو دائیں طرف دھکا دے کر گرا دیا تھا۔ عامر نے بائیں طرف چھلانگ لگائی تھی اور کیپٹن علی ماہر کمانڈو کی طرح وہیں زمین سے چپک کر رہ گیا اُس نے گرتے گرتے اپنے ہولسٹر سے پستول نکال لیا تھا۔

زمین پر لیٹے لیٹے علی نے اندازے سے دو تین فائر مختلف اطراف میں کیے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اُٹھ کر حوالات کے دروازے کی طرف بھاگا۔ اس دوران اُس نے دیکھ لیا تھا کہ پیٹرک کے ساتھ ہی سپاہی بھی زمین پر ڈھیر ہو چکا تھا۔ علی برق رفتاری سے دوڑتا ہوا دروازے کے باہر تک آیا جہاں کسی حملہ آور کا نام و نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ واپسی پر اُس نے دیکھا سپاہی تو بے چارہ دم توڑ چکا تھا۔ پیٹرک لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ کسی نے سائیلنسر لگی طاقتور رائفل سے گولیاں چلائی تھیں۔ اور حملہ آور کا نشانہ ایسا شاندار تھا کہ دونوں کے عین دل پر گولیاں لگی تھیں۔ حوالات کا عملہ حواس باختہ ہو کر چاروں اطراف میں بھاگ رہا تھا۔ علی پیٹرک کے نزدیک جُھک کر بیٹھ گیا۔

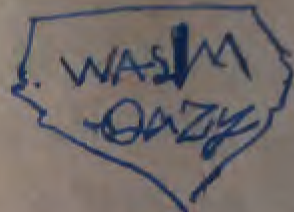
"ڈاک ٹر.... ٹماں... گو" پیٹرک نے لڑکھڑاتی زبان سے بمشکل یہ الفاظ ادا کیے تھے کہ اُس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ اُس کی پھٹی پھٹی آنکھیں کیپٹن علی سے کہ رہی تھیں "میں نہ کہتا تھا کہ میں یہاں غیر محفوظ ہوں!!" کیپٹن علی نے تأسف بھری نظر اُس کی لاش پر ڈالی پھر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُسے پیٹرک سے زیادہ اُس سپاہی کے مرنے کا افسوس تھا جو بالکل بے گناہ مارا گیا تھا۔ علی نے چند ثانیے کھڑے ہو کر کچھ سوچا پھر دوبارہ بیٹھ کر لاشوں کا معاینہ کرنے لگا۔ اب عامر اور ٹیپو بھی اُٹھ کر کپڑے جھاڑتے اُس کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہاں شہر کے تقریباً سب ہی اعلیٰ افسران پہنچ چکے تھے۔ پیٹرک کے اس طرح مارے جانے پر سب ہی پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ کیونکہ ایک وہی بظاہر ایسا ملزم نظر آ رہا تھا جس سے پاؤڈر کے متعلق کسی اطلاع کی اُمید کی جا سکتی تھی۔

علی کی ہدایت پر پولیس کے فوٹوگرافروں نے لاشوں کی تصاویر بنائیں پھر لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے ہسپتال بھیج دیا گیا۔

واپسی کا سفر تینوں نے خاموشی سے طے کیا تھا۔ علی

کے ذہن میں ابھی ایک اور کلو باقی تھا۔ اُس نے اب ہیبت خاں پر قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا تھا۔ ہیبت خاں کی نگرانی کے لیے علی نے اپنے اعتبار کے اور کافی آدمی متعین کیے تھے۔ اُسے ایک خفیہ ٹھکانے پر رکھا گیا تھا اور ابھی تک اخباری نمایندوں کو بھی اُس سے ملاقات کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔



سرکس اور لاش

عامر اور ٹیپو اس وقت سٹار سرکس میں سب سے اگلی قطار میں بیٹھے تھے۔ یہ سرکس دُنیا بھر میں اپنی ایک خاص شہرت رکھتا تھا، جس میں دُنیا کے اکثر ممالک کے فنکار کام کیا کرتے تھے۔ یہاں ایسے ایسے کمالات دکھائے جاتے تھے جو اور کسی سرکس میں دیکھنے کو نہیں ملتے تھے۔ اس وقت سرکس کا آخری شو چل رہا تھا۔ یہ شو رات کو ۹ بجے شروع ہوتا تھا اور ۱۱ بجے رات گئے ختم ہُوا کرتا تھا۔ سارا پنڈال تیز روشنیوں کی چکا چوند میں ڈوبا نظر آ رہا تھا۔ مائیک پر اعلان ہُوا اور سرکس کا کھیل شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے کچھ مسخروں نے اُلٹی سیدھی قلابازیاں لگا کر تماشائیوں کو محظوظ کیا پھر فضا میں ایک جال سا تان دیا گیا، جس کے دونوں سروں پر سیڑھیوں سے لگے سرکس کے فنکاروں نے اپنے اپنے کمالات دکھائے اور سامعین کی بے پناہ داد زوردار تالیوں کی صُورت میں سنائی دینے لگی۔

اب سرکس کا وہ آئٹم شروع ہونے والا تھا جس کے لیے اس سرکس کی دُنیا بھر میں شہرت تھی کیونکہ ایسا خطرناک آئٹم اور کہیں دیکھنے کو نہیں ملا کرتا تھا۔ روشنیاں سرکس کے درمیانی دائرے پر مرکوز کر دی گئیں۔ تماشائیوں کو شیر کی دھاڑ سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی ایک شیر سرکس کے کونے سے برآمد ہُوا جس کے ساتھ ہاتھ میں کوڑا پکڑے ایک لڑکی بھی چلی آ رہی تھی۔ شیر نے اپنی مخصوص جگہ پہنچ کر جُھک کر تماشائیوں کو سلام کیا اور ایک میز پر بیٹھ گیا۔ لڑکی نے اُس کی پُشت سہلائی تو شیر نے اپنا مُنہ کھول دیا۔ اس کے ساتھ ہی لڑکی نے اپنا ہاتھ شیر کے کُھلے مُنہ میں دے دیا۔ لوگ یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ پہلے تو سارا پنڈال سکتے میں آ گیا پھر لوگوں نے زور زور سے تالیاں پیٹ کر لڑکی کو داد دینا شروع کی۔

ابھی تالیوں کا شور جاری ہی تھا کہ اچانک لائٹ آف ہو گئی۔

پنڈال میں اندھیرا ہوتے ہی دو تین چیخیں بلند ہُوئیں۔ یوں محسُوس ہو رہا تھا جیسے کسی کو ذبح کیا جا رہا ہو اور ذبح ہونے والا چلا چلا رہا ہو۔ تماشائیوں نے خوف سے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اپنی اپنی سیٹوں سے اُٹھ کر دروازوں کی طرف بھاگنے لگے۔ ایک کھلبلی سی ہر طرف مچ گئی تھی۔ دھکم پیل کرتے لوگ ایک دُوسرے کے قدموں کے نیچے آ رہے تھے۔ سرکس کے

ملازمین نے اس موقعے پر عقل مندی کا مظاہرہ کیا اور بڑی تیزی سے پنڈال کے ساتھ باہر جانے والی قناتیں اُوپر اُٹھا دیں اس طرح لوگوں کو باہر نکلنے کا راستہ مل گیا اور افراتفری کے عالم میں سارا ہجوم باہر کی طرف لپکا۔

قریباً پانچ منٹ بعد یہ طوفان بدتمیزی ذرا کم ہُوا جب اچانک روشنیاں جل اُٹھیں۔ شاید باہر روشنی کے نظام میں کوئی خلل پڑا تھا جس کی درستگی کے بعد اب لائٹ واپس آگئی تھی۔ عامر اور ٹیپو جو اس طوفان بدتمیزی سے بچنے کے لیے ایک کونے میں سکڑ کر کھڑے ہو گئے تھے یہ دیکھ کر چونک پڑے کہ پنڈال کے درمیان جہاں سرکس کے فنکار اپنے کرتب دکھایا کرتے تھے وہاں اس سرکس کے مالک مسٹر مارٹن کی لاش پڑی تھی۔ ابھی تک اس کے جسم سے خون جاری تھا۔

خیریت گزری کہ شیر کو رِنگ ماسٹر نے قابو کر کے پنجرے میں بند کر دیا تھا ورنہ صورتِ حال بہت ابتر ہو جاتی۔

دونوں تیزی سے چلتے لاش کے قریب آگئے۔ خون کی ایک لکیر یہاں سے اُس مقام تک جا رہی تھی جس دروازے سے کرتب دکھانے والے فنکار اندر داخل ہُوا کرتے تھے۔ پہلی ہی نظر میں دونوں نے بخوبی اندازہ لگا لیا کہ مارٹن کو قتل کر کے باہر سے اندر لایا گیا ہے اور قاتل یا قاتلوں نے بڑی افراتفری

کے عالم میں اُسے یہاں پھینکا تھا۔

کرتب دکھانے والی لڑکی کا تو نام و نشان یہاں نظر نہیں آ رہا تھا۔ سرکس کے باقی فنکار بھی اپنی اپنی جگہ دبک کر بیٹھ گئے تھے صرف سرکس کے ملازمین اپنے خوف زدہ چہروں پر حیرانگی کے تاثرات لیے وہاں موجود تھے۔ بچے کھچے تماشائیوں نے لاش پر نظر پڑتے ہی دوڑ لگا دی تھی۔ کیونکہ سب کو علم تھا کہ تھوڑی دیر بعد پولیس یہاں آجائے گی اور خواہ مخواہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ اب لاش کے گرد عامر، ٹیپو یا پھر سرکس کے ملازمین نے گھیرا ڈال رکھا تھا۔

دس پندرہ منٹ بعد پولیس بھی آگئی۔

ان میں کیپٹن علی بھی موجود تھا جو اس حادثے کی اطلاع ملتے ہی یہاں چلا آیا تھا کیونکہ اسے علم تھا کہ عامر اور ٹیپو آج یہیں موجود ہیں۔

"خیریت؟" عامر کے چہرے پر نظر پڑتے ہی بے ساختہ اُس کے مُنہ سے نِکلا۔

"جہاں آپ نے قدم رکھا وہاں خیریت کا کیا کام" عامر نے لاش کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا۔

"حالانکہ یہ حادثہ تمہاری موجودگی میں پیش آیا ہے۔ میں تو بعد میں آیا ہُوں" علی نے مسکراتے ہُوئے کہا۔

"آپ کی صحبت کا اثر ہے۔ ورنہ اتنے عرصے سے یہ سرکس چل ہی رہا تھا۔ اسے بھی شاید آج ہی قتل ہونا تھا۔ اصل میں یوں تو آپ آنے سے رہے۔ چلیے اسی بہانے سہی آپ یہاں آئے تو" عامر بولا۔

کیپٹن علی اب لاش کے نزدیک جھک کر بیٹھا تھا۔ پولیس کے باقی لوگ سرکس کے ملازمین اور فنکاروں کو اکٹھا کر رہے تھے تاکہ اُن کے بیانات لیے جا سکیں۔ کیپٹن علی نے ایک تھانیدار کو اشارہ کیا کہ وہ مارٹن کی جیبوں کی تلاشی لے۔ تلاشی لینے پر اُس کی جیبوں سے کچھ رقم، رسیدیں اور ایک تڑا مُڑا کاغذ برآمد ہوا۔ کاغذ کھول کر علی نے اُس پر نظریں دوڑائیں۔ لکھا تھا:

مارٹن!

تم بہت غیر محتاط ہوتے جا رہے ہو اور ایسے شخص کو میں ہرگز پسند نہیں۔ تم سے نیا رِنگ ماسٹر رکھنے کے لیے کس نے کہا تھا۔

"ٹی"

"ٹی" پر نظر پڑتے ہی کیپٹن علی چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ فوراً اس کے ذہن میں ٹانگو کا لفظ آ گیا جو مرتے ہوئے پیٹرک کی زبان سے نکلا تھا۔ اس سے پہلے کہ پولیس کے کسی اور آدمی کی نظر اِس کاغذ کے ٹکڑے پر پڑے، اُس نے کاغذ کا یہ ٹکڑا

اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ سرکس کے ملازمین سے الگ الگ سوالات کر رہا تھا۔ اُس نے جان بوجھ کر سرکس کے مینجر فیاض کو آخر میں طلب کیا تھا اور اب وہ اس سے سوالات کر رہا تھا۔

"تم کب سے اس سرکس کے ساتھ وابستہ ہو؟"

"جی پچھلے پانچ سال سے" فیاض نے اطمینان سے جواب دیا۔

"پہلے کہاں کام کرتے تھے؟"

"گڈ لک سرکس میں۔"

"اچھا، یہ بتاؤ آج تم نے مسٹر مارٹن کو معمول سے ہٹ کر کچھ کرتے دیکھا تھا؟" علی نے تین چار اسی طرح کے سوالات کرنے کے بعد اچانک اُس سے براہِ راست سوال کر دیا۔

"میں سمجھا نہیں" فیاض نے اُلجھتے ہوئے کہا۔

"میرا مطلب ہے تم آخر عرصہ سے اس کے ساتھ کام کر رہے ہو۔ آج کوئی غیر معمولی بات تو نہیں دیکھی؟"

"جی کوئی خاص تو نہیں بس......" فیاض اچانک بات کرتے کرتے خاموش ہو کر اُس طرف دیکھنے لگا جدھر سے سرکس کا نیا رِنگ ماسٹر اندر داخل ہو رہا تھا۔ علی نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی اور اُسے دیکھ کر فیاض چند لمحوں کے لیے گھبرایا بھی تھا لیکن پھر نارمل ہو گیا۔ علی نے بالکل یوں ظاہر کیا

جیسے اُس نے نیامن کی اس کیفیت کو نوٹ ہی نہ کیا ہو۔

"جناب، میں یہ پُوچھنے حاضر ہُوا تھا کہ ہم کیا خود کو زیرِ حراست سمجھیں"؟ رِنگ ماسٹر نے علی کی طرف دیکھ کر بڑے غصّے سے پُوچھا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بہرحال آپ لوگوں کے بیانات تو ہم نے لینے ہی ہیں۔ اس لیے بغیر اطلاع دیے آپ باہر نہیں جا سکتے" علی نے اُس سے نظریں ملائے بغیر جواب دیا۔

"یہ آپ ہماری شخصی آزادی پر حملہ کر رہے ہیں۔ غلط بات ہے یہ۔ ہم کیا ملزم ہیں جو پولیس سے اجازت لے کر کہیں جائیں گے؟ غضب خدا کا، بھرے پڑے مجمع میں ایک قتل ہوگیا۔ ہمارا مالک مارا گیا۔ تمام ملازمین اور فن کار پہلے ہی بہت پریشان ہیں اُلٹا پولیس ہمیں کو ہراساں کر رہی ہے۔ میرے خیال سے آپ ہماری تفتیش کرنے کے بجائے قاتل کو تلاش کرتے تو زیادہ بہتر تھا" وہ زور زور سے غصّے میں بولنے لگا۔

علی نے پہلے تو اُس کو نظرانداز کیا جب کسی طرح رِنگ ماسٹر خاموش نہ ہُوا تو اُس نے سختی سے اُسے ڈانٹ دیا اور پولیس کو حکم دیا کہ اب کسی کو وہاں آنے کی اجازت نہ دے۔

پولیس والے رِنگ ماسٹر کو دھکیلتے ہُوئے نزدیکی خیمے میں لے گئے جہاں باقی ملازمین اور فن کار بیٹھے تھے۔

"ہاں! تم کچھ کہنا چاہتے تھے؟" وہ دوبارہ نیامن کی طرف متوجہ ہُوا۔

"جناب، میرے اور مارٹن صاحب کے تعلقات کا سب کو علم ہے۔ میرے نزدیک تو اُن کی حیثیت میرے والد کی سی تھی۔ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے وہ — بالکل بچوں کی طرح۔ میں بھی زیادہ ان کے قریب رہتا تھا" یہ کہتے ہُوئے نیامن کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اُس نے اپنی جیب سے رُومال نکال کر آنکھیں پونچھیں پھر بولا "آج صبح میں نے اُن کے نزدیک ایک ایسے شخص کو دیکھا تھا جس کے متعلق میں ہمیشہ شک و شبے کا شکار رہا"۔

"کون ہے وہ؟"

"چھوٹے سے قد کا عجیب و غریب شخص ہے جناب۔ اُسے آج میں نے دو سال بعد دیکھا ہے۔ دو سال پہلے ہم نے اپنا سرکس پڑوسی ملک میں لگایا تو اُس کو میں نے باس سے ملتے دیکھا تھا۔ باس نے اس کا تعارف ڈاکٹر صاحب کہہ کر کروایا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ دونوں بہت پرانے دوست ہیں اور ایک عرصے بعد اُن کی آپس میں ملاقات ہُوئی ہے۔ کافی دیر تک دونوں تنہائی میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ پھر ڈاکٹر چلا گیا۔ اُس روز میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے ہنس مکھ باس کو پریشان دیکھا۔ نہ جانے اس شخص میں کیا بات تھی کہ وہ

پھر میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا۔ اُس کے جانے کے بعد دو تین روز تک باس پریشان رہے، پھر معمول کی طرح زندگی گزارنے لگے۔ میں نے اُن سے بہتیرا پوچھا کہ اس پریشانی کا سبب کیا ہے لیکن انھوں نے کچھ نہیں بتایا" ایک لمحے کے لیے رُک کر اُس نے سگرٹ سُلگایا اور دو تین لمبے لمبے کش لیے۔

کیپٹن علی بخوبی اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ خود کو نارمل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ بے چارہ اپنے باس کی موت پر بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

— "جناب والا! اب دو سال بعد دوبارہ میں نے اس بونے ڈاکٹر کو دیکھا تو میں حیران رہ گیا۔ نہ جانے کیوں یہ شخص مجھے ابھی تک یاد تھا۔ اُس نے باس کے خیمے میں اُس سے ملاقات کی پھر چلا گیا۔ یہ پرسوں کی بات ہے۔ پرسوں سے باس بہت پریشان تھے۔ افسوس مجھے اُنھوں نے کچھ نہیں بتایا، وہ اپنے خیمے میں زیادہ وقت لیٹ کر ہی گزارتے تھے۔ آج ایک اور شخص اُن سے مل کر گیا۔ جس کے بعد تو انھوں نے خود کو اپنے خیمے تک محدود کر لیا تھا۔ اُنھوں نے مجھے خاص طور سے ہدایت کی تھی کہ کسی کو ان سے ملنے کی اجازت نہ دی جائے کیونکہ اُن کی طبیعت خراب ہے۔ آخری شو شروع

ہونے پر وہ کچھ دیر کے لیے فن کاروں کے خیمے میں آئے تھے۔ میرے قریب ہی بیٹھے رہے۔ ابھی انھیں بیٹھے بمشکل دس پندرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ لائٹ آف ہو گئی۔ ہمارے ہاں بجلی کا جنریٹر سسٹم موجود ہے۔ اس لیے لائٹ آف ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایسا اس سے پہلے کبھی نہیں ہُوا تھا۔ اس طرح تو ہمارا سرکس ہی نہیں چل سکتا۔ میں نے سمجھا شاید جنریٹر میں کوئی نقص پیدا ہو گیا ہے۔ میں ابھی یہ دیکھنے کے لیے کھڑا ہی ہُوا تھا کہ کسی نے میرے سر پر زوردار ضرب لگائی۔ مجھے صرف اتنا احساس ہُوا کہ دو تین آدمی باس کو گھسیٹ کر وہاں سے لے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔ شاید پانچ چھ منٹ بعد مجھے ہوش آیا۔ اس اثنا میں لائٹ بھی آ چکی تھی اور سرکس کے ملازمین نے میرے مُنہ پر پانی کے چھینٹے مار کر مجھے ہوش دلائی تھی۔ ہوش میں آنے پر میں نے اپنے مالک کو اِس حالت میں دیکھا" اِتنا کہہ کر وہ بچوں کی طرح رونے لگا۔

کیپٹن علی نے اُس سے کچھ نہ کہا اور گردن دوسری طرف پھیر کر کچھ سوچنے لگا۔ اُس نے عامر اور ٹیپو کو اس اثنا میں دوسرے ملازمین کے بیانات لینے کے لیے دوسری طرف بھیج دیا تھا۔ فیاض جلد ہی نارمل ہو گیا۔

"ٹھیک ہے مینجر صاحب، آپ جا سکتے ہیں" اُس نے فیامن سے کہا۔

"شکریہ جناب۔ جب بھی میری ضرورت محسوس ہو، میں حاضر ہوں" یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔

"رنگ ماسٹر کو لے آؤ" علی نے دُور کھڑے ایک حوالدار کو بُلا کر حکم دیا۔

اگلے ہی لمحے رنگ ماسٹر اُس کے سامنے موجود تھا۔ اُس کے چہرے سے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ بہت غصّے میں ہے۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" علی نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہُوئے پُوچھا۔

"ولیم۔"

"کب سے کام کر رہے ہو یہاں؟"

"گزشتہ دو ماہ سے۔"

"اِس سے پہلے کہاں کام کرتے تھے؟"

"میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ اب تک یہی سوال درجنوں مرتبہ مجھ سے پُوچھا جا چکا ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟ ایک تو ہمارا مالک قتل ہو گیا۔ اُلٹا قاتل کو گرفتار کرنے کے بجائے آپ ہمیں پریشان کر رہے

ہیں۔ میں تو یہاں دو ماہ سے ملازم ہُوں۔ فیامن سب سے پُرانا ملازم ہے، اُس سے آپ سب کچھ پُوچھ لیں ناں" اُس نے غصّے سے کھولتے ہُوئے کہا۔

"دیکھو مسٹر ولیم! مجھے پولیس افسر بننے پر مجبُور نہ کرو اور نہ ہی زیادہ چالاکی دکھاؤ، ورنہ ہمیں اپنے سوالات کے جوابات وصُول کرنے کا اور طریقہ بھی آتا ہے۔ جو کچھ تم جانتے ہو، صاف صاف بتا دو" علی نے کرخت لہجے میں کہا۔

"جناب، میں نے عرض کیا ناں کہ مجھے یہاں ملازمت کرتے صرف دو ماہ گزرے ہیں۔ آپ پُرانے ملازمین سے پُوچھ لیں" اس مرتبہ وہ خاصا نرم پڑ گیا تھا۔

"تم ڈاکٹر ٹانگو کو کب سے جانتے ہو؟" علی نے اچانک اُس کے چہرے پر آنکھیں گاڑتے ہُوئے ایسا سوال کر دیا جس نے اُسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ ڈاکٹر ٹانگو کا نام سُنتے ہی ولیم کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا تھا۔ لیکن جلد ہی سنبھل گیا۔

"گویا مجھے پھانسنے کا پروگرام آپ نے پہلے ہی بنا لیا ہے۔ میں سوائے اپنے ڈاکٹر کے اور کسی کو نہیں جانتا۔"

"دیکھو ولیم، تم سب کچھ جانتے ہو۔ اگر کُتّے کی موت مرنے کا ارادہ ہے تو اُسے چھپائے رکھو۔ تم جانتے ہو کہ وہ تمہیں زمین کی ساتویں تہہ سے نکال کر جان سے مار ڈالے گا۔ بہتر یہی ہے

کہ مجھے اُس کے متعلق سب کچھ بتا دو۔ جو تم جانتے ہو۔"

"کیپٹن علی" ولیم نے بڑے پُرسکون لہجے میں کہا "حیران نہ ہونا، میں نے تمھاری تصویر بھی پہلی مرتبہ ڈاکٹر ٹانگو کے پاس ہی دیکھی تھی۔ اُس نے دُنیا کے خطرناک آدمیوں کی لسٹ میں تمھارا نام بھی لکھا ہُوا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم صرف میرے سوال کا جواب دو" علی نے اُس کی بات نظر انداز کرتے ہُوئے کہا۔ اُسے حیرانگی ضرور ہُوئی تھی کہ ولیم کو اُس کی اصلیت کا علم ہے۔

"میں اور ٹانگو کبھی بڑے پکّے دوست تھے۔ ہم لوگ یورپ کی ایک مجرموں کی تنظیم میں اکٹھے ہی کام کیا کرتے تھے۔ میرا اور اُس کا تعارف آج سے بارہ سال پہلے ایک غیر قانونی کام ہی کے سلسلے میں ہُوا تھا۔ ہم دونوں آپس میں مال کا تبادلہ کر رہے تھے وہیں ہم بہترین دوست بن گئے۔ مجھے ڈاکٹر ٹانگو سے ملنے کا بے حد شوق تھا کیونکہ میرے علم میں یہ بات آئی تھی کہ ٹانگو حیرت انگیز اور پُراسرار قوتوں کا مالک ہے۔ واقعی وہ ایک پُراسرار اور عجیب و غریب شخص ہے۔ ایک مرتبہ ہم ایک سمندری راستے سے غیر قانونی مال لے کر جا رہے تھے۔ لانچ میں ٹانگو کے ساتھ میں بھی موجود تھا کہ اچانک ہم گھیرے میں آ گئے۔ بڑا زبردست مقابلہ ہُوا۔ ہمارے

ساتھی ایک ایک کر کے مرنے لگے۔ میرے اور ٹانگو کے علاوہ صرف دو ساتھی زندہ بچے۔ وہ بھی زخمی تھے۔ کسی نہ کسی طرح ٹانگو بحری پولیس کا گھیرا توڑ کر بھاگ نکلا۔ ہم لوگ سمندر میں راستہ بھول کر بھٹک گئے اور تین روز کے بعد ایک غیر آباد جزیرے میں جا پہنچے۔ یہ جزیرہ سینکڑوں میل لمبے جنگل پر مشتمل تھا۔ یہیں ہم وحشیوں کے قابو آ گئے۔ لیکن میں حیران رہ گیا اِن آدم خور جنگلیوں کو ڈاکٹر ٹانگو نے ایسے ایسے شعبدے دکھائے کہ وہ ہمیں قتل کرنے کے بجائے ہماری پُوجا کرنے لگے۔ ٹانگو اِن کا دیوتا بن کر یہاں رہنے لگا۔ پولیس نے اس دوران ہماری تلاش بڑی سرگرمی سے شرُوع کر دی تھی۔ انٹرپول بین الاقوامی پولیس ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے لگی ہُوئی تھی۔ ہم نے یہیں چھُپے رہنے میں عافیت جانی کیوں کہ ابھی تک مہذب دُنیا کو اس پُراسرار جنگلی جزیرے کا علم نہیں ہُوا تھا۔ یا پھر کسی نے اس طرف جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس جزیرے میں ٹانگو نے ایک روز ایک گہرے غار سے ایک پُراسرار سا سفوف دریافت کر لیا۔ یہ سفوف بہُت خطرناک ہے اور کیمیادی ہتھیار بنانے کے کام آ سکتا ہے۔ اس دریافت نے ٹانگو کا دماغ ہی خراب کر دیا۔ اُس نے کروڑ پتی بننے کا منصوبہ بنایا اور مجھے کہا کہ وہ اپنا علیحدہ گروہ بنا کر اِس

پاؤڈر کو دُنیا کے مختلف ممالک میں غیر قانونی طور پر دہشت پسندوں
کے ہاتھ فروخت کرکے کروڑوں روپے کمائے گا۔ ہمارے دونوں
ساتھی ہمارے رازدار بھی تھے اور حصّہ دار بھی تھے۔ ایک روز ٹانگو
نے اِن دونوں کو مار ڈالا۔ اُس روز سے یہ خوف مجھے بھی دامنگیر
رہنے لگا کہ کسی نہ کسی دن یہ ڈاکٹر ٹانگو مجھے بھی مار ڈالے گا۔
سو میں کسی نہ کسی طرح وہاں سے جان بچا کر نکل آیا" اس نے
ایک لمبی سانس لی اور کہنے لگا۔

"اس کے بعد ٹانگو نے اپنا گروہ بنا لیا۔ ساری دُنیا میں
اُس کے ایجنٹ موجود ہیں جن کے ذریعے وہ یہ خطرناک کیمیکل
پاؤڈر فروخت کرتا ہے۔ اب اس کی طاقت کا یہ عالم ہے کہ
بڑے بڑے سیاسی گروہ اس کی مدد سے اپنی حکومتوں کا تختہ
اُلٹتے ہیں۔ اس دوران مجھے ایسے لوگوں کی تلاش ہی رہی جن
کے ذریعے میں بھی اُس جزیرے تک پہنچ کر وہاں سے اپنا
حصّہ وصُول کر سکوں۔ مارٹن بھی ڈاکٹر ٹانگو کے گروہ کا آدمی تھا۔
میں اسی لیے اُس تک پہنچا تھا کہ اُس کی مدد سے ٹانگو کو
ٹھکانے لگا کر اپنا اُلّو سیدھا کر دوں۔ میں نے مارٹن کو اعتماد میں
لے لیا تھا لیکن افسوس کہ ٹانگو نے اپنا کام دکھا دیا۔ جنگل میں
ایک عرصہ تک رہنے سے میں جانوروں سے بہت مانوس
ہو چکا ہوں اس لیے رنگ ماسٹر بن کر جانوروں کی تربیت

کر رہا ہوں۔ یہی آڑ لے میں نے مارٹن کے سرکس میں شمولیت
اختیار کی تھی لیکن.....“ وہ اپنی بات کہہ کر ٹھنڈی سانس
لے کر خاموش ہو گیا۔

"مسٹر ولیم! اگر تم مجھے جان ہی گئے ہو تو یہ بھی جان
لو کہ اِس ملک میں ہم ڈاکٹر ٹانگو کی دال نہیں گلنے دیں گے۔
جہاں تک تمھاری بات کا تعلق ہے تو آج سے تم ہمارے
دوست ہو گئے ہو۔ مجھے اُمید ہے کہ ہم مل کر کام کریں گے"
کیپٹن علی نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

ولیم نے اس کا ہاتھ تھام کر گرم جوشی سے دباتے ہُوئے
کہا کیپٹن علی مجھے تمھاری دوستی پر فخر ہے۔ اب میری زندگی کا
صرف ایک ہی مقصد رہ گیا ہے کہ میں ٹانگو کو ٹھکانے لگا دوں۔
میں نے اس کے ہاتھوں بڑے صدمے جھیلے ہیں۔ اب میں اس
سے انتقام لیے بغیر شاید کبھی چین سے مر بھی نہیں سکوں گا۔"

"تم مطمئن رہو مسٹر ولیم، ہم مل کر اس کی تلاش میں
نکلیں گے۔ مجھے بھی اس ڈاکٹر ٹانگو سے اپنا حساب چکانا ہے"
کیپٹن علی نے بڑے پُراعتماد لہجے میں اسے کہا۔

ولیم نے زندگی بڑے بڑے مجرموں کے ساتھ گزاری
تھی لیکن اُس نے جو اعتماد اس وقت کیپٹن علی کے چہرے پر
دیکھ لیا تھا وہ اُسے اور کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ اُسے احساس ہونے

لگا تھا کہ علی اُس کا خواب ضرور پُورا کرے گا اور وہ اپنی زندگی میں اپنے دشمن ڈاکٹر ٹانگو کو مرتے ہُوئے دیکھ سکے گا۔ یہی سوچ کر اُس نے علی سے تعاون کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"فی الحال تم یہیں کام کرتے رہو۔ ہم جلد ہی اپنی مہم پر نکلیں گے" علی نے رُخصت ہونے سے پہلے اُس سے کہا تھا۔

فن کار اور بھاری بنڈل

"میں تمہارا خُون پی جاؤں گا۔ دفع ہو جاؤ۔ مجھے تمہاری کسی بات کا اعتبار نہیں، میں کسی ڈاکٹر ٹانگو کو نہیں جانتا" ہیبت خاں نے عامر کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہُوئے کہا۔

"سردار! اچھا ذرا میرے نزدیک آؤ۔ میں تمہیں ایک کام کی بات بتاتا ہُوں" عامر نے ہیبت خاں کو سلاخوں کے نزدیک آنے کا مشورہ دیتے ہُوئے کہا۔

اُسے کیپٹن علی نے یہاں بھیجا تھا کہ جس طرح ممکن ہو ہیبت خاں سے ڈاکٹر ٹانگو کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ وُہ پہلے تو اِس حکم پر قدرے گھبرایا تھا پھر "مرتا کیا نہ کرتا" کے مصداق یہاں چلا آیا۔

اُس کی شکل پر نظر پڑتے ہی ہیبت خاں کا خُون کھولنے لگا تھا۔ جس طرح عامر نے اُسے اب تک بے وقوف بنایا

تھا اس کے بعد سے تو ہیبت خاں کا جی چاہتا تھا کہ اُسے گلا گھونٹ کر مار ڈالے۔ ہیبت خاں تو اُس کی بات ہی سُننے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن کسی نہ کسی طرح اُس نے ہیبت خاں کو اپنی بات سُنانے پر راضی کر ہی لیا تھا۔

"کیا بات ہے؟" اُس نے سلاخوں کے نزدیک آ کر عامر کو پھاڑ کھانے والے لہجے میں مخاطب کرتے ہُوئے پُوچھا۔

پہلے تو عامر نے اس طرح اِردگرد دیکھا جیسے یہ یقین کرنا چاہتا ہو کہ انھیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ پھر بڑی راز داری کے لہجے میں چہرے پر مکمّل سنجیدگی طاری کرنے کے بعد اُس نے کہنا شرُوع کیا "دیکھو سردار، میں تمھاری طرح کوئی بے وقوف آدمی نہیں ہُوں۔ زیادہ جذباتی بننا صحت کے لیے اچھی بات نہیں ہوتی۔ مجھے سرکاری افسروں سے بھی بنا کر رکھنی پڑتی ہے۔ میں درپردہ اِن لوگوں کے کام بھی کر دیا کرتا ہُوں۔ ان کے ساتھ تعاوُن کرنے کی وجہ سے آج تک میں جیل خانے سے محفوظ رہا ہُوں ورنہ میں بھی آج تمھاری طرح اس کال کوٹھڑی میں پڑا ہوتا۔ مجھے تمھارے ساتھ ہمدردی کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ لیکن تم بہادُر آدمی ہو اور مجھے بھی علاقہ غیر میں تمھارے جیسے دوست کی تلاش تھی۔ جس طرح میں نے تمھیں پکڑوایا ہے اسی طرح تمھیں یہاں سے نِکال بھی سکتا ہُوں۔

اسی لیے میں یہاں آیا ہُوں۔ اگر تُم بھی میری طرح اِن لوگوں سے کچھ تعاون کروگے تو میں کوئی نیا چکّر چلا سکتا ہُوں ورنہ میری طرف سے جاؤ جہنّم میں۔" اس نے ہیبت خان پر نیا جال پھینکتے ہُوئے کہا۔

ہیبت خاں نے اس کی طرف ہاں اور نہ کی مِلی جُلی کیفیّت کے ساتھ دیکھا لیکن اُس وقت عامر اس کمال کی اداکاری کر رہا تھا کہ علی یہاں موجُود ہوتا تو عش عش کر اُٹھتا۔ اُس نے اپنے چہرے پر پُوری طرح سنجیدگی طاری کر رکھی تھی۔ جس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بالکل سچ بول رہا ہے۔

"لیکن تم خطرناک آدمی ہو۔ تم نے مجھے دھوکا دیا۔" ہیبت خاں نے پھر غصّے سے کہا۔

"اوہو! سردار، میری بات سمجھو۔ میں ایک لمبے چکّر میں پھنس گیا تھا۔ غلطی سے میں ایک قتل کر بیٹھا تھا اور اِن لوگوں نے مجھے کہا تھا کہ اگر تم سردار ہیبت خاں کو گرفتار کروا دو تو تمھاری جان بچ سکتی ہے۔ میں نے تو اپنی جان بچانے کے لیے تمھیں گرفتار کروایا تھا۔ اس سے پہلے ہمارا تعارف تو تھا نہیں۔ اب مجھے احساس ہُوا ہے کہ میں نے تم جیسا بہادُر آدمی اپنے ہاتھوں کھو کر بڑی غلطی کی۔ یہ لوگ اب مطمئن بھی ہو چکے ہیں اور میرا وہ قتل والا کیس بھی ختم

ہو چکا ہے۔ اب موقع دیکھ کر میں نے اُن کے سامنے یہ پتا پھینکا ہے۔ تمھاری مرضی ہے۔ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا" یہ کہ کر عامر نے چاہا کہ وہاں سے نکل جائے لیکن ہیبت خاں نے اُسے آواز دے کر روک لیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر اپنی بے وقوفی کے ہاتھوں عامر کے جال میں پھنس رہا تھا۔

"دیکھو، ہم نے ٹانگو کا نام ضرور سُنا تھا۔ کسی نے آج تک اُسے دیکھا نہیں ہے۔ وہ بڑا کایاں آدمی ہے۔ مجھے اُس کی طرف سے معمولی کام پر بڑی بڑی رقم ملا کرتی تھی۔ اُس نے مجھے ایک لمبی رقم دے کر اس کام کے لیے تیار کیا تھا کہ میں بچّوں کو اغوا کر کے مُلک میں خوف و دہشت کی فضا پیدا کر دُوں۔ اِس کے بعد وہ یہاں کیا کرنا چاہتا تھا۔ اس کے متعلق میں کُچھ نہیں کہ سکتا۔"

"تُم سچ کہتے ہو کہ تمھیں اور کسی بات کا علم نہیں؟" عامر نے اُس کی طرف دیکھ کر پُوچھا۔

"دیکھو، میں تمھاری طرح چکر باز آدمی نہیں ہُوں۔ جو باتیں میں جانتا تھا، بتا دی ہیں۔ اب تم مجھے یہاں سے نکالنے کی ترکیب کرو۔ میں تمھارا مُنھ موتیوں سے بھر دُوں گا۔ تمھیں مالا مال کر دُوں گا" اُس نے اپنی دانست میں عامر کو لالچ دیا تھا۔

"دیکھو سردار، مجھے اُمید تھی کہ تُم ٹانگو کی گرفتاری میں مدد دو گے لیکن تم کُچھ جانتے ہی نہیں۔ اس لیے میری طرف سے اب جاؤ جہنّم میں!"

ابھی اُس کے مُنھ سے پُوری بات نکلی ہی تھی کہ غصّے سے کھولتے ہُوئے ہیبت خاں نے ہاتھ باہر نکال کر دُور سے اُسے مُکّا مارنا چاہا تھا۔ یہ الگ بات کہ عامر تیزی سے پیچھے ہٹا اور ہیبت خاں کا سر زور سے سلاخوں سے ٹکرایا۔ وہ غصّے سے تلملا کر اُٹھا اور عامر کو زور زور سے صلواتیں سُنانے لگا جو ہنستے ہُوئے وہاں سے دُور ہٹ گیا تھا۔

— ○ —

دیکھنے والا منظر تھا۔ عامر ایک مضبوط رسّے کے ساتھ اُلٹا لٹکا ہُوا تھا اور ٹیپو اُسے دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔

"اب کیا حکم ہے میرے آقا؟" عامر نے بندروں کی طرح اُلٹے لٹکے کیپٹن علی سے پُوچھا جو اس کے سامنے ایک کُرسی پر بیٹھا لاپروائی سے ایک کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔

"کم از کم مزید پانچ منٹ اسی پوزیشن میں اُلٹے لٹکے رہو" علی نے بڑی سنجیدگی سے کتاب پر نظریں جماتے ہُوئے جواب دیا۔

"اِس کے بعد آپ مجھے مردہ شکل میں نیچے ضرور اُتار

پہنچے گا۔ ظاہر ہے اتنی دیر میں تو چنگے بھلے آدمی کا انتقال ہو سکتا ہے۔ میں بے چارہ کس باغ کی مولی ہوں" عامر نے جلے کٹے لہجے میں اُلٹے لٹکے ہوئے کہا۔

"بولتے رہو۔ اس طرح تمہارا دھیان بٹا رہے گا اور اپنی موجودہ حالت کی طرف تمہاری توجہ بھی نہیں رہے گی۔ پھر مجھے بھی یقین ہوتا رہے گا کہ تم ابھی خیر سے زندہ ہو" علی نے اسی طرح سنجیدگی سے کہا۔

"مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ آخر اتنے عرصے بعد آپ کو یہ بھولی ہوئی ورزشیں کہاں سے یاد آنے لگی ہیں" عامر نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

"تھوڑی دیر بعد خود ہی سب کچھ سمجھ جاؤ گے" علی نے کہا۔

"یا پھر کچھ بھی سمجھنے کے قابل نہیں رہیں گے" ٹیپو نے، جو نزدیک ہی کھڑا ہنس رہا تھا، بڑی مشکل سے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے لیکن ہمت کرنے سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ آخر اِس طرح اُلٹے لٹکے رہنے میں کیا مضائقہ ہے۔ سیدھے ہو کر بھی تم نے بولنا ہی ہے، اسی طرح بولتے رہو" علی نے اُسے مشورہ دیا۔

"اب اس سے زیادہ ہمت مجھ میں نہیں ہے" عامر نے

جو پندرہ بیس منٹ سے اُلٹا لٹکا ہوا تھا، سیدھا ہوتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تمہاری مرضی۔ نیچے آ جاؤ۔"

"کمال کرتے ہیں آپ۔ جب آپ کو علم ہے کہ اس تکلف کے بغیر بھی میں بازی گری کر سکتا ہوں تو خواہ مخواہ مجھے کیوں عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے" عامر نے سیدھا کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ اُس کا چہرہ مسلسل اُلٹے رہنے سے سُرخ ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے جسم کا سارا خون اُس کے چہرے میں آ گیا ہو۔

یہ ورزشیں اُس نے قریبًا چار پانچ ماہ بعد دوبارہ شروع کر دی تھیں۔ جب کبھی علی نے اُسے بازی گر بنانا ہوتا تھا۔ وہ اُس سے اسی طرح کی ورزشیں شروع کروا دیا کرتا تھا۔ اُس نے عامر کو کچھ کمالات ایسے سکھا دیے تھے جن کی مدد سے وہ کسی بھی سرکس میں اپنے لیے جگہ بنا سکتا تھا۔ عامر یہ بات بھی جانتا تھا کہ کیپٹن علی خود کمال کا بازی گر ہے۔ وہ ایسے ایسے کرتب دکھا سکتا تھا جن کے متعلق بڑے بڑے بازی گر صرف سوچ کر ہی رہ جایا کرتے تھے۔ اب بھی کیپٹن علی کسی نئے منصوبے پر عمل کرنے جا رہا تھا جس میں عامر کو کسی سرکس ہی میں کام کرنا تھا۔

ستار سرکس کو اب مارٹن کا بیٹا پیٹر چلا رہا تھا۔

پیٹر مارٹن کی واحد اولاد تھی۔ اُس کی بیوی پیٹر کو جنم دے کر مر گئی تھی لیکن مارٹن نے دُوسری شادی نہیں کی۔ اُس کا بیٹا بزنس میں ہمیشہ اس کے ساتھ ہی رہا تھا۔ پچھلے تین ماہ سے وہ اپنے مُلک چھٹی گزار رہا تھا۔ باپ کی موت کی اطلاع ملنے پر وہ یہاں چلا آیا۔ اُس نے اپنے باپ کی جگہ بڑی کامیابی سے سنبھال لی تھی اور ایک مرتبہ پھر ستار سرکس اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی۔ اس کام میں فیاض اور رنگ ماسٹر ولیم اُس سے مکمل تعاون کر رہے تھے۔ اب تو وہ فن کار جو مارٹن کی موت کے بعد مایوس ہو کر دُنیا کے اس عظیم الشان سرکس کو الوداع کہنے کے متعلق سوچ رہے تھے اپنا خیال بدل کر دوبارہ ستار سرکس سے وابستہ ہو چکے تھے۔

اِس وقت پیٹر مارٹن اور رنگ ماسٹر ولیم ایک خیمے میں بیٹھے آرام کر رہے تھے۔ سرکس کا پہلا شو شروع ہونے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے اور ملازمین تیاریوں میں مصروف تھے کہ ایک نوعمر لڑکا اور ایک نوجوان اُن کے خیمے میں داخل ہُوئے۔

"ہمیں اِس سرکس کے مالک سے ملنا ہے۔" اُنھوں نے بغیر سلام دُعا کے انھیں مخاطب کر کے کہا۔

"کون ہو تم لوگ؟" ولیم نے انھیں پہچانتے ہُوئے پُوچھا۔

"تم اس سرکس کے مالک ہو؟" نوجوان نے چونک کر کہا۔

"کمال ہے بھئی، پہلے اپنا تعارف کراؤ پھر مالک سے بھی مل لینا" ولیم نے کہا۔

"اُستاد ذرا گرم طبیعت کے ہیں اور عام آدمی سے بات نہیں کیا کرتے۔" نوعمر لڑکے نے جواب دیا۔

"بھئی یہ عام آدمی نہیں، اس سرکس کے رنگ ماسٹر مسٹر ولیم ہیں" پیٹر نے ولیم کا تعارف کرایا۔

"اور یہ ہمارے مالک مسٹر پیٹر مارٹن ہیں" ولیم نے کہا۔

"میرا نام چارلی اور اِس کا نام ٹونی ہے۔ میں اُستاد ہُوں اور یہ میرا شاگرد۔ ہم باتیں نہیں کیا کرتے کام کرتے ہیں۔ جو کرتب ہم جانتے ہیں وہ اِس شہر تو کیا، اِس مُلک میں کوئی نہیں جانتا" نوجوان، جس نے اپنا نام چارلی بتایا تھا، بولا۔

"جاؤ یار، ہمارا سر نہ کھاؤ۔ تم جیسے بہت دیکھے ہیں کرتب دکھانے والے" ولیم نے بظاہر اُسے دھتکارتے ہُوئے کہا۔

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ ابھی تمھیں پتا چل جائے گا اور ہمارے کرتب دیکھ کر تم اس طرح بڑھ چڑھ کر باتیں بھی نہیں کرو گے۔ سمجھے" نوجوان چارلی نے غصّے سے کہا۔

"اچھا، آؤ ذرا دیکھیں تمھارے کرتب" ولیم بھی غصّے سے کھڑا ہو گیا۔

"چلو بھئی، ہم بھی دیکھ لیں" پیٹر نے کاروباری دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

چاروں رِنگ میں پہنچ گئے تھے۔ اُن کا تماشہ دیکھنے کے لیے سرکس کے تمام فن کار اور ملازمین بھی وہیں آ گئے تھے۔ انھیں اُمید تھی کہ جلد ہی دونوں ناکام اور شرمندہ ہو کر واپس لوٹ جائیں گے۔ اس سے پہلے بھی اس سرکس میں شرکت کے متمنی اکثر شوقیہ فن کار اسی طرح یہاں آتے تھے لیکن پھر شرمندگی اُٹھا کر واپس چلے گئے تھے۔ سٹار سرکس میں شمولیت بچوں کا کھیل تو نہیں تھی۔

لیکن!

اس مرتبہ معاملہ سب کی توقعات کے برعکس رہا۔ دونوں نے وہ وہ کمالات دکھائے کہ بڑے بڑے آرٹسٹ زبان دانتوں تلے دبا کر رہ گئے۔ سرکس کے مالک پیٹر مارٹن نے دونوں کو خطیر معاوضے پر ملازم رکھ لیا تھا۔

اب سرکس کی شہرت اور زیادہ بڑھنے لگی تھی۔ ان دونوں فن کاروں کی شمولیت نے سٹار سرکس کی شہرت کو چار چاند لگا رہے تھے۔ دونوں آرٹسٹ لوگوں میں بڑے مقبول ہونے لگے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ سرکس میں بھی پیٹر اور رِنگ ماسٹر ولیم کے دل میں اُن کا احترام بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے

برعکس کچھ آرٹسٹ اور سرکس کا مینجر فیاض ایسے لوگ بھی تھے جو اُن سے بہت حسد کرنے لگے تھے کیونکہ اِن کے آنے کے بعد اُن کی قدر و منزلت پیٹر کی نظر میں کم ہونے لگی تھی۔

ولیم بہت محتاط آدمی تھا اور جانتا تھا کہ ڈاکٹر ٹانگو جیسے شخص کا مقابلہ کرنے کے لیے اُسے ہر قدم احتیاط کے ساتھ اور پھونک پھونک کر اُٹھانا ہوگا۔ آج تک اُس نے خود کو ٹانگو کی نظروں سے چھپائے رکھا تھا لیکن اب وہ اس کی نظروں میں آ چکا تھا۔ اس لیے بہت چوکنا رہنے لگا تھا۔

کیپٹن علی نے اُسے اعتماد میں لینے کے بعد عامر اور ٹیپو کو یہاں چارلی اور ٹونی کے رُوپ میں داخل کیا تھا لیکن اس نے کبھی کسی کو اس بات کا شائبہ بھی نہیں گزرنے دیا تھا کہ وہ اِن کا پہلے سے واقف ہے۔

○

سرکس کے مینجر فیاض کا خیمہ آخری سرے پر بنا ہُوا تھا۔ اِس وقت وہ اپنے خیمے میں موجود تھا۔ اُس کے ساتھ شوکا اور اُس کے دونوں ساتھی بھی بیٹھے تھے۔ شوکا کہنے کو تو یہاں کے جانوروں کا انچارج تھا لیکن حقیقت میں وہ سرکس کا مانا ہُوا غنڈہ تھا۔ جسے صرف اِس کام کے لیے ملازم رکھا گیا تھا جب کبھی کہیں مار دھاڑ کی ضرورت پیش آتی سرکس مالکان اُسے

آگے کر دیا کرتے تھے۔ اُسے اِس کام کی خاصی تنخواہ بھی مل رہی تھی۔

اِس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد دُوسرا شو شرُوع ہونے والا تھا۔ انھیں فوراً یہاں سے رُخصت ہونا تھا لیکن وہ اچانک صرف چند منٹ کے لیے یہاں اکٹھے ہو گئے تھے تاکہ تیاری کے دوران ان کی غیر حاضری کسی کے علم میں نہ آ سکے۔

"شوکے! تم بالکل ناکارہ ہو کر رہ گئے ہو۔ مجھے سمجھ نہیں آتی، ایک معمولی سا آدمی تمھارے قابُو نہیں آ رہا" فیاض نے، جو خاصے غصّے میں دکھائی دے رہا تھا، اُسے مخاطب کرتے ڈانٹتے ہُوئے کہا۔

"سر، وہ ہماری اور آپ کی توقعات سے بڑھ کر خطرناک آدمی ہے۔ اوّل تو وہ اپنے خیمے میں سوتا ہی نہیں۔ اگر سوتے بھی تو اُس کا بندوبست ایسا ہوتا ہے کہ وہاں کوئی داخل ہی نہیں ہو سکتا۔ معمولی آہٹ پر وہ بیدار ہو جاتا ہے۔ ہم اس سے پہلے دو مرتبہ کوشش کر چکے ہیں لیکن عین وقت پر وہ ہاتھوں سے نکل گیا" شوکے نے صفائی پیش کرتے ہُوئے کہا۔

"کمبختو! تمھارے منصُوبے میں ضرور کوئی خامی رہ جاتی ہو گی۔ وہ آخر انسان ہی ہے" فیاض غصّے سے بولا۔

"جناب، وہ انسان نہیں چھلاوہ ہے چھلاوہ" شوکے نے کہا۔

"وہ کچھ بھی ہو لیکن یہ بات یاد رکھنا۔ اگر وہ کل تک ختم نہ ہُوا تو وانگلے تمھیں ختم کر دے گا۔ اُس نے یہ آخری وارننگ دی ہے اور وانگلے کی آخری وارننگ کا مطلب تم اچھی طرح سمجھتے ہو۔ وہ ٹانگو کا نائب ہے اور اپنے آدمیوں کی معمولی غلطی بھی معاف نہیں کرتا۔ اُس کے نزدیک انسان اور کیڑے مکوڑے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم بھیانک موت مارے جاؤ" فیاض نے اُسے وانگلے نام کے شخص کی وارننگ پہنچائی۔

"ٹھیک ہے سر! آپ وانگلے باس سے کہہ دیجیے کہ آج کی رات ولیم کی زندگی کی آخری رات ہو گی۔ اُسے آج بہر صورت مرنا ہو گا۔ خواہ مجھے اپنا کوئی آدمی ہی کیوں نہ مروانا پڑے" شوکے نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"شوکے، آج رات تمھیں اپنی اور رِنگ ماسٹر ولیم کی زندگی میں سے کسی ایک کا فیصلہ کرنا ہے۔ اِس لیے سنبھل کر کام کرنا" فیاض کا لہجہ بڑا سرد تھا۔

وہ کمال کا مکّار آدمی تھا۔ جس طرح کیپٹن علی کے سامنے رو رو کر وہ مارٹن سے ہمدردی کی باتیں کر رہا تھا، اُس کے بعد اس کا یہ رُوپ واقعی چونکا دینے والا تھا۔

شوکا اور اُس کے ساتھی باہر نکل گئے۔ اُن کی روانگی کے بمشکل دو منٹ بعد فیاض بھی باہر آگیا کیونکہ سرکس کا شو شروع ہونے کا اعلان کیا جا چکا تھا۔ اُس کے جاتے ہی فیاض کے پلنگ کے نیچے چھپا نیا فن کار مسٹر ٹونی بھی باہر نکل آیا۔ وہ یہاں کافی دیر سے چھپا ان کی گفتگو سُن رہا تھا اور اب سیدھا عامر کے پاس رپورٹ دینے جا رہا تھا۔



آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔

سرکس کے تمام فن کار اور ملازمین اپنے اپنے خیموں میں گہری نیند سو رہے تھے۔ ہر طرف گہرا سناٹا اور اندھیرا طاری تھا۔ تمام لائٹیں آف تھیں۔ اس دوران ایک خیمے سے ایک سایہ سا برآمد ہُوا۔

یہ شوکا تھا!

اُس نے اپنے چہرے کو چھپانے کے لیے ایسا نقاب اوڑھ رکھا تھا کہ اُس کی صرف آنکھیں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ بڑے پنے تلے قدموں سے چلتا ہُوا وہ رِنگ ماسٹر ولیم کے خیمے کی طرف آ رہا تھا۔ اُس کے دماغ پر فیاض کے یہ الفاظ ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے کہ اگر آج رات رِنگ ماسٹر ولیم کو ٹھکانے نہ لگایا تو وانگلے اسے مار ڈالے گا۔

وانگلے جو اِس ملک میں ڈاکٹر ٹانگو کے نائب کے فرائض انجام دے رہا تھا، اپنے گروہ میں "خونی وانگلے" کے نام سے جانا جاتا تھا، اپنی خونخواری اور بربریت کی وجہ سے اس کی دہشت گروہ کے ہر رُکن کے دل و دماغ پر طاری رہتی تھی۔ وہ حکم دے کر اُس کی ہر صورت میں تعمیل چاہتا تھا۔ اگر گروہ کا کوئی کارندہ اُس کا حکم پُورا کرنے میں ناکام رہتا تو اُسے اذیت ناک موت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

شوکا جانتا تھا کہ وانگلے کی طرف سے "آخری وارننگ" جاری ہو چکی ہے اور اس کے بعد وہ کسی صورت میں اُسے معاف نہیں کرے گا۔

رِنگ ماسٹر ولیم کے خیمے کے نزدیک پہنچ کر وہ رُک گیا۔ چاروں طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔ نزدیک دُور کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے ایک مرتبہ رُک کر اطراف کا جائزہ لیا اور اپنی پتلون میں اُڑسا زہر آلود خنجر نکال کر بڑے اطمینان سے خیمے کی باہر والی کینوس کی چادر کو کاٹ دیا۔ ولیم کے خیمے میں ہلکی روشنی کی لالٹین جل رہی تھی اور وہ خود اپنی چارپائی پر چادر اوڑھے گہری نیند سو رہا تھا۔

شوکے کی آنکھوں میں خونی چمک جاگ اُٹھی۔ اُس نے بڑی احتیاط سے کینوس کی چادر کاٹ کر اپنے لیے داخلے کا

راستہ بنایا اور بغیر آواز پیدا کیے اندر آگیا۔ خیمے میں آکر اُس نے خنجر کو مضبوطی سے ہاتھ سے پکڑ کر ہاتھ کو حملہ کرنے کے انداز میں اُوپر اُٹھایا اور سوتے ہُوئے ولیم کی طرف بڑھنے لگا۔ پھر اُس کے نزدیک پہنچ کر اُس نے خنجر والے ہاتھ کو زور دار جھٹکا دیا اور اندازے سے خنجر اپنی دانست میں ولیم کے عین دل میں پیوست کر دیا۔ یہ الگ بات کہ وہاں ولیم موجود ہی نہیں تھا۔

شوکے کا خنجر ایک روئی کے سرہانے میں گھُس گیا تھا۔ ولیم کی جگہ اس کے تکیے موجود تھے۔ شوکے کے ماتھے پر خوف سے پسینہ آگیا۔ آج بھی ولیم کے بچ نکلنے کا صرف ایک ہی مطلب تھا۔ اور وہ تھا اُس کی موت۔ اُس نے خوف اور غصے کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ تلملا کر خنجر نکالا اور خیمے کے دروازے کے راستے تیزی سے باہر کو لپکا۔ لیکن دروازے سے اندر آنے والے نے اس سے بھی زیادہ تیزی کا مظاہرہ کیا تھا۔

اس سے پہلے کہ شوکے کو صورتِ حال کی سمجھ آتے، اندر آنے والے نے اپنے ہاتھ میں پکڑے پستول کا دستہ زور سے اس کی کنپٹی پر مارا۔ ضرب اتنی جاندار تھی کہ شوکے جیسا شخص بھی پہلے ہی وار میں لڑکھڑا گیا لیکن زمین پر گرنے سے پہلے اُس حملہ آور نے اُسے اپنے مضبوط بازوؤں میں تھام لیا تھا۔

یہ عامر تھا!

اُس نے لپک کر بے ہوش شوکے کو بوری کی طرح اپنے کندھے پر ڈالا اور باہر نکل آیا۔ اُسے باہر نکلتے دیکھ کر نزدیکی خیمے سے ایک اور سایہ برآمد ہُوا اور لپک کر اُس کے پاس پہنچ گیا۔

"کیسا رہا؟"

"ویل ڈن" آنے والے کے مُنھ سے نکلا۔

عامر نے اپنا بوجھ اُسے منتقل کر دیا تھا۔ یہ کیپٹن علی تھا۔ جس نے بڑی پھُرتی سے بے ہوش شوکے کو اپنے کندھے پر منتقل کر لیا تھا۔

"سنبھال کر حضور، بنڈل خاصا وزنی معلوم ہوتا ہے" عامر نے آہستہ سے اُس کے کان میں کہا۔

علی نے پلٹ کر اُس کے کندھے پر تھپکی دی۔ یہ اس کا شاباش دینے کا مخصوص انداز تھا۔ پھر قریباً بھاگتے ہُوئے وہاں سے دُور ہی دُور ہٹتا چلا گیا۔

سرکس کے ملازمین کے خیموں کی قطار جہاں ختم ہوتی تھی اُس سے آگے میدانی علاقہ خودرو جنگلی گھاس سے اٹا ہُوا تھا۔ اس گھاس کی دُوسری طرف ایک جیپ میں انسپکٹر ناصر

ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا علی کا منتظر تھا۔ اُسے اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ جیسے ہی علی بے ہوش شوکے سمیت جیپ میں پہنچا، ناصر نے اگنیشن میں لگی چابی کو گھمایا اور جیپ تیز رفتاری سے کیپٹن علی کے ایک خفیہ ٹھکانے کی طرف دوڑنے لگی۔

گدھے کے سر سے سینگ...

اگلی صبح تو فیاض واقعی چکرا کر رہ گیا۔

رنگ ماسٹر ولیم نے معمول کے مطابق عین وقت پر آکر اُسے رپورٹ دی کہ سرکس کے کچھ جانور کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ولیم کی شکل پر نظر پڑتے ہی فیاض کو زمین اپنے قدموں تلے سرکتی محسوس ہوئی لیکن اس نے ہمت کرکے اپنی حالت پر قابو پا لیا اور مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔

"یہ شوکا کمبخت کہاں مر گیا مینجر صاحب؟" ولیم نے لاعلمی کے سے انداز میں فیاض سے دریافت کیا۔

"کیوں کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟" فیاض نے اپنی گھبراہٹ چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی تک جانوروں کو چارہ نہیں ملا اور کیا وقت ہونے کو آ رہا ہے۔ نہ جانے آپ نے کیسے لاپروا آدمیوں کو بھرتی کر رکھا ہے۔ اگر یہی صورتِ حال رہی تو جانوروں کی کوئی

گارنٹی نہیں دے سکتا۔ پھر مجھے الزام نہ دیجیے گا" ولیم نے فیاض کو خبردار کرنے کے انداز میں وارننگ دی۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔ جانے کمبخت کہاں جا مرا؟" فیاض کے لیے اس وقت سب سے بڑا مسئلہ ولیم سے جان چھڑانا تھا۔

"جیسے آپ کی مرضی" رنگ ماسٹر ولیم اُس پر اُچٹتی سی نظر ڈال کر جس طرف سے آیا تھا فیاض کو پریشان چھوڑ کر اسی طرف چل دیا۔

جیسے ہی ولیم اُس کی نظروں سے اوجھل ہوا فیاض نے نزدیک کھڑے ایک خاص مُلازم کو اشارہ کر کے نزدیک بُلایا۔ "شوکے کو بُلا کر لاؤ۔ ابھی، اسی وقت" اُس نے غصّے سے کھولتے ہوئے کہا۔

"لیکن لائیں کہاں سے جناب؟"

"کیا مطلب ہے تمھارا۔ میں سمجھا نہیں" اُس کا پارہ اور چڑھ گیا۔

"جناب، میں کیا عرض کروں۔ میں تو خود بڑا پریشان ہوں۔ میں اور شوکا ایک ہی خیمے میں رہتے ہیں۔ رات دو بجے کے بعد وہ مجھے ایک ضروری کام کا کہہ کر چلا گیا اور ابھی تک واپس نہیں آیا۔ میں نے اُس سے بہتیرا پوچھا کہ اس

وقت کیا مصیبت آن پڑی ہے۔ لیکن اس نے کچھ بتایا ہی نہیں۔ بس تھوڑی دیر بعد واپس آنے کا کہہ کر ایسا گیا ہے کہ ابھی تک واپس نہیں لوٹا"

"کیا بکتے ہو" فیاض اتنی زور سے چلّایا کہ اُسے کھانسی اٹھنے لگی۔

"حضور، میں بالکل ٹھیک عرض کر رہا ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے کسی بات کا علم نہیں" ملازم نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

"ابھی دفع ہو جاؤ۔ وہ جہاں بھی ہے اُسے ڈھونڈھ کر لاؤ ورنہ میں ایک ایک کر کے تمھاری ساری ہڈیاں توڑ ڈالوں گا" فیاض نے کھانسی پر قابو پاتے ہوئے اور غصّے سے کانپتے ہوئے اپنے ملازم کو حکم دیا۔

اس شخص کا شمار فیاض کے خاص آدمیوں میں ہوتا تھا لیکن اُس نے آج سے پہلے کبھی فیاض کو اتنے غصّے کے عالم میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ بے چارہ چپ چاپ باہر نکل آیا۔ فیاض نے خود کو نارمل کرنے کے لیے ایک آرام دہ کرسی پر ڈھیر کر دیا۔ اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اُس کے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہوئی جا رہی تھیں۔ اس کے غصّے میں اب خوف بھی شامل ہونے لگا تھا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر ولیم اس مرتبہ بھی کیسے

بچ نکلا؟ اور سب سے بڑھ کر پریشانی والی بات تو یہ تھی شو کا بھی ابھی تک غائب تھا۔

ابھی اس نے بمشکل اپنی حالت پر قابو ہی پایا تھا کہ ایک طوفان بدتمیزی اُس کے خیمے میں گھس آیا۔ فیاض نے دیکھا سرکس کے دس بارہ آرٹسٹ جن کی کمان رنگ ماسٹر ولیم کر رہا تھا، شور مچاتے اُس کے خیمے میں گھس آئے۔ ولیم غصے سے کھول رہا تھا اور دو تین آدمیوں نے بمشکل اس کو قابو میں کر رکھا تھا۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے وہ فیاض پر حملہ کرنے آیا ہو۔

"کیا بات ہے؟ کیوں آسمان سر پر اُٹھا رکھا ہے" فیاض نے اُسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟ آسمان میں نے نہیں آپ کی لاپروائی نے سر پر اُٹھا رکھا ہے۔ میں یہاں نوکری کرنے آیا ہوں۔ اپنی محنت اور فن کی کمائی کھاتا ہوں، کوئی بھیک نہیں مانگتا۔ نہ ہی کسی کے باپ کا غلام ہوں۔"

"کچھ کہو گے یا بکتے چلے جاؤ گے؟" فیاض نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے غصے سے دریافت کیا۔

"میں کہتا ہوں یہ سرکس ہے یا بھٹیار خانہ۔ تیسری مرتبہ میرے ساتھ یہ حادثہ ہو رہا ہے اور آپ کے کان پر جوں تک

نہیں رینگتی۔ آخر یہ لوگ میری جان لینے پر ہی کیوں تلے ہوئے ہیں۔ آج پھر کسی نے میرے خیمے کی بیرونی قنات پھاڑ دی ہے۔ آخر میرے ہی ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ آپ کے ساتھ تو ایسا نہیں ہوتا۔ اور کسی کے ساتھ بھی ایسا نہیں ہوتا۔ اب میں ایک پل کے لیے یہاں نہیں رکوں گا۔ اب میں یہاں سے سیدھا پولیس اسٹیشن جاتا ہوں اور رپورٹ درج کروا کر ہی واپس لوٹوں گا۔ مجھے آپ کی ہمدردی اب نہیں چاہیے۔ جب بھی آپ سے شکایت کی ہے آپ نے خاموشی اختیار کرنے کو کہا ہے۔ جناب والا! آپ کی تسلیاں اور تشفیاں تو میری جان لے لیں گی۔ بس میں اب کسی کی بات نہیں سنوں گا۔ میں سیدھا جا رہا ہوں تھانے رپٹ درج کرانے" وہ اپنی دھن میں بولتا چلا جا رہا تھا اور سرکس کے باقی آرٹسٹ اُسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"اوہو! تم آخر کہنا کیا چاہتے ہو؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی" فیاض نے زچ ہونے کے انداز میں کہا۔

"آپ کو ابھی سمجھ نہیں آئے گی۔ جب ایک آدھ کی جان چلی جائے گی پھر آپ کو سمجھ پڑے گی کہ اصل معاملہ ہے کیا۔ آخر آپ پولیس میں رپورٹ کیوں نہیں درج کرا دیتے؟"

آرٹسٹوں میں سے چارلی نے ولیم کے بجائے مینجر فیاض

کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"تم خاموش رہو۔ اسے بات کرنے دو" فیاض کے ایک غنڈے سے ملازم نے چارلی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"تو بھی چپ رہ بے تیچے کہیں کے۔ تجھے بھی بولنے کی ضرورت نہیں" چارلی نے بھی جواب میں اُسے ڈانٹ پلا دی۔

"کیا کہا؟" غنڈے نے چارلی کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"ابھی بتا دیتا تجھے، ذرا مینجر صاحب کا احترام ہے" چارلی نے فیاض کی طرف اشارہ کیا۔

"تیری ایسی کی تیسی" کہتے ہوئے غنڈہ بڑی تیزی سے چارلی پر حملہ آور ہوا۔ اُس کا حملہ کرنے کا انداز ایسا تھا جیسے چارلی کو جان سے مار ڈالے گا۔ یہ الگ بات کہ چارلی پھُرتی سے ایک طرف ہٹ گیا اور وہ غنڈہ سامنے دھری لوہے کی چارپائی سے جا ٹکرایا۔ اس کا منھ اتنی زور سے چارپائی سے ٹکرایا کہ اس سے خون بہنے لگا۔

اس کے ساتھ ہی چارلی خیمے سے نکل کر پنڈال کی طرف آگیا کیونکہ اندر جگہ تنگ پڑنے لگی تھی۔ اُس کے تعاقب میں باقی لوگ بھی اُسی طرف لپکے۔ زخمی غنڈے کو ایک دو آرٹسٹوں نے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ غصّے اور

انتقام کی آگ میں اندھا ہو رہا تھا۔ وہ غصّے سے کھولتا پھر چارلی کی طرف بڑھا اور اُس کے منھ پر پوری قوت سے گھونسا رسید کرنا چاہا۔ اِس مرتبہ پھر چارلی اُسے جُل دے گیا۔ غنڈے کا ہاتھ گھوما اور ہوا میں لہراتا ہوا پنڈال کے ایک بانس سے جا ٹکرایا۔ اُس کے ہاتھ پر خاصی ضرب آئی تھی جس سے اُس کا غصّہ دو چند ہو گیا۔ اُس نے نزدیک رکھا سٹول اُٹھا لیا اور چارلی کی طرف پھینکا لیکن چارلی کے قدم تو گویا زمین پر ٹکتے ہی نہیں تھے۔ وہ ایک طرف ہٹ گیا اور سٹول سیدھا ایک اور ملازم کے پیٹ میں لگا جس نے غصّے اور درد سے کراہتے ہوئے ایک ہاتھ پیٹ پر رکھا اور وہی سٹول دوسرے ہاتھ سے گھما کر حملہ آور پر پھینکنا چاہا۔ مینجر فیاض، جو اُسے گالیاں دیتا منع کرنے کے لیے اُس کی طرف بڑھ رہا تھا، وہی سامنے آگیا اور سٹول اُس کے ماتھے پر جا لگا۔ اس کے ساتھ ہی ایک ایسا طوفان بدتمیزی بپا ہوا کہ الامان۔ وہ سب ایک دوسرے الجھنے لگے۔

انھیں آپس میں لڑتے دیکھ کر ولیم اور دونوں نئے آرٹسٹ وہاں سے کھسک گئے۔ اس ہنگامے میں کسی نے شاید اپنا کام دکھا دیا تھا۔ کیونکہ جب سرکس کے ایک ملازم کی رپورٹ پر پولیس پنڈال میں پہنچی تو سرکس کے پانچ ملازم زخمی تھے اور

مینجر خیامن ایک کونے میں ڈھیر ہُوا پڑا تھا۔ کسی نے بڑی صفائی سے زہر آلود خنجر اُس کے دل میں اُتار دیا تھا۔

پولیس انسپکٹر جو اپنے تین چار سپاہیوں کے ساتھ یہاں آیا تھا لاش دیکھ کر گڑبڑا گیا۔ اُس نے فوراً اعلیٰ حکام کو خبر کر دی اور تھوڑی ہی دیر بعد ایس پی بخاری پولیس کی جمعیت کے ساتھ وہاں تفتیش کے لیے موجود تھا۔ اُس نے پولیس کو حکم دیا کہ سرکس کو گھیرے میں لے لیا جائے اور کسی کو یہاں سے بھاگ نکلنے کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔

ایس پی بخاری کو کیپٹن علی سے خدا واسطے کا بیر تھا اور دونوں میں اکثر نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ اس وقت بخاری نے سرکس کے تمام ملازمین کو ایک کونے میں کھڑا کیا ہُوا تھا اور وہ باری باری ان کے بیانات سُن رہا تھا۔

"اُن تینوں کو بھی پیش کرو" اس نے بالآخر انسپکٹر کو حکم دیا۔

"جناب، وہ تینوں تو غائب ہیں" انسپکٹر نے کہا۔

"کیا مطلب ہے تمھارا؟ تم ہوش میں تو ہو؟" بخاری نے اُسے ڈانٹ دیا۔

"دفع ہو جاؤ اور انھیں ہر صورت میں میرے سامنے پیش کرو"

پولیس نے سارے علاقے کو گھیرے میں لے کر تینوں کی تلاش شروع کر دی لیکن وہ تو ایسے غائب ہُوئے تھے جیسے گدھے کے سر سے سینگ!

بُخاری کی پریشانی

ایس پی بخاری کا غصّے کے مارے بُرا حال تھا۔ اُس نے وائرلیس کے ذریعے علاقے کے پولیس اسٹیشنوں کو مطلع کر دیا تھا اور پولیس کے جوان سفید کپڑوں میں بڑی سرگرمی سے تینوں کو تلاش کر رہے تھے۔ اُن کے حُلیے شہر کے تمام پولیس سٹیشنوں پر پہنچ چکے تھے لیکن وہ ہوتے تو کسی کو نظر آتے۔

چند روز بعد ہی یہ اِس سرکس میں دُوسرا قتل ہُوا تھا۔ پولیس کے لیے بڑی تشویش کی بات تھی۔ اس لیے اب اعلیٰ افسران کی آمد بھی یہاں شروع ہو گئی تھی۔ آنے والوں میں کیپٹن علی بھی شامل تھا۔ اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی بخاری کے ماتھے پر بل آجانا قدرتی بات تھی۔

"آپ نے اس کو بہت ڈھیل دے رکھی ہے۔ ہر معاملے میں ٹانگ اڑا دیتا ہے۔ سیدھا سادا پولیس کیس ہے۔ اس میں

اِس شخص کا کیا کام؟" اس نے آئی جی آفریدی صاحب کے نزدیک ہو کر کہا۔

"مسٹر بخاری! میں نے آپ کو اکثر کہا ہے کہ اپنے کام سے کام رکھا کریں۔ کوئی کچھ کرتا پھرے آپ کو اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے" آفریدی صاحب نے کہا اور بخاری "او کے سر" کہتا ہوا پرے ہٹ گیا۔ اُس نے جب کبھی آئی جی صاحب کو کیپٹن علی کے متعلق کچھ کہنے کی کوشش کی اسی طرح کا جواب ملتا تھا۔ لیکن بخاری نے گویا باز رہنا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔

"ہیلو سر!" کیپٹن علی نے اُس کی شکل پر نظر پڑتے ہی حسب معمول مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہیلو" بخاری نے غصّے سے جواب دیا۔

"میں تو بازار سے سبزی لینے جا رہا تھا۔ یہاں ہنگامہ دیکھ کر اسی طرف چلا آیا ہوں۔ یہاں آکر دیکھا تو معاملہ کافی سنگین دکھائی پڑا اِس لیے جانے کو دل بھی نہیں چاہ رہا" کیپٹن علی نے مسکراتے ہوئے ایس پی بخاری کو مخاطب کیا۔ اس کی یہ مخصوص مسکراہٹ بخاری کو جلا کر رکھ دیا کرتی تھی۔

"میں ایسے بہُت سے بہانے سُن چکا ہوں۔ زیادہ

باتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیا تمھارا ہر مرتبہ ایسی جگہوں سے گزرنا ضروری ہوتا ہے؟" ایس پی بخاری نے اُس کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوہو! جناب، آپ تو یونہی ناراض ہو جاتے ہیں۔ اب اس میں میرا کیا قصور ہے کہ جس جگہ سے میں نے گزرنا ہوتا ہے وہیں کوئی نہ کوئی مصیبت منہ اُٹھائے کھڑی رہتی ہے۔"

"زیادہ ہوشیاری دکھانے کی ضرورت نہیں۔ میرے لیے تم ایک بچّے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ سمجھے!" بخاری نے غصّے سے کھولتے ہوئے کہا۔

"اس کے باوجود اگر آپ کو میری خدمات کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ جب جی چاہے مجھے یاد فرمالیجیے گا۔ میرا فون نمبر تو آپ کے پاس ہو گا ہی...." کیپٹن علی نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

ایس پی بخاری نے اُس کو گھور کر دیکھا اور پھر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

پولیس کے فوٹوگرافروں نے لاش کی مختلف زاویوں سے تصویریں لینی شروع کر دی تھیں۔ پھر آئی جی صاحب اکڑوں بیٹھ کر اُس کی جیبوں کی تلاشی لینے لگے۔ اس دوران ایک

چھوٹا سا کاغذ کا ٹکڑا اُن کے ہاتھ لگا جس پر نظریں دوڑانے کے بعد اُنھوں نے وہی ٹکڑا نزدیک کھڑے کیپٹن علی کی طرف بڑھا دیا۔ علی نے کاغذ کے پُرزے پر نظریں دوڑائیں جس پر تحریر تھا:

"پولیس کی نظروں میں آجانے والے نااہل
لوگوں کی میرے نزدیک کم از کم سزا موت
ہے۔"
"وانگلے"

کاغذ کا پُرزہ ہاتھ میں پکڑ کر کیپٹن علی نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا پھر مُسکرا کر رُقعہ جیب میں ڈال لیا۔ بخاری جو اُس پر نظریں جمائے کھڑا تھا، تلملا کر ہی تو رہ گیا۔

"جناب والا! اس کی کیا ضرورت تھی۔ یہ تحریر تفتیش میں ہمارے لیے بہت مددگار ثابت ہو سکتی تھی۔ آپ نے اُسے دے دی ہے؟" ایس پی بخاری نے اپنی طرف سے بڑی رازداری سے کام لیا تھا اور آئی جی آفریدی کے نزدیک ہوتے ہُوئے اُن سے احتجاج کیا تھا۔

"ایس پی صاحب! آپ کیوں خواہ مخواہ میرا دماغ چاٹنے پر تُلے ہیں۔ میں نے آپ کو کتنی مرتبہ بتایا ہے کہ اعلیٰ حکام کی طرف سے سختی سے ہدایت کی گئی ہے کہ کیپٹن علی کو پولیس ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے شکایت کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔

میں اس سے ہر ممکن تعاون کرنے کا پابند ہوں اور آپ سے بھی میں یہی درخواست کروں گا کہ بجائے کیپٹن علی کے لیے پریشان ہونے کے آپ اپنے کام پر توجہ دیا کیجیے۔ پولیس کی موجودگی میں یہاں سے تین مشتبہ ملزم فرار ہو گئے ہیں۔ آپ کیا یہاں جھک مار رہے تھے؟ آپ کی موجودگی میں واقعے کے تین اہم گواہ ہمارے ہاتھوں سے نکل گئے ہیں" آفریدی صاحب کو غصّہ آنے لگا تھا۔

"جناب والا! یہ اس کمبخت انسپکٹر کی وجہ سے....."

"براہِ کرم اب کم از کم بہانہ کوئی نہ بنائیے" آئی جی نے اُس کی بات کاٹتے ہُوئے کہا۔

بخاری دل ہی دل میں کیپٹن علی کو کوستا ہُوا دوسری طرف چلا گیا۔ لاش کو اب اُن لوگوں نے ایمبولینس میں پہنچا دیا تھا اور پولیس کی حفاظت میں اسے پوسٹ مارٹم کے لیے لے جایا جا رہا تھا۔

O

کیپٹن علی ابھی واپس آیا ہی تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی ٹرّانے لگی۔ یہ اُس کا خاص نمبر تھا جس کا نمبر ایکسچینج کو بھی نہیں تھا۔

"کون؟" اِس نے فون اُٹھاتے ہُوئے پُوچھا۔

"آپ کا خادم" دُوسری طرف عامر اُس سے مخاطب تھا اُس وقت دو اور مظلوموں کے ساتھ گلیوں میں دھکّے کھاتا پھر رہا ہوں اور پولیس ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔"

"کھاتے رہو دھکّے تمھاری قسمت" کیپٹن علی نے بظاہر لاپرواہی سے کہا۔

"مجھے اپنی پروا نہیں۔ یہ میرے ساتھ جو دو اور جانیں لگی ہیں اُن کی وجہ سے کہ رہا ہُوں۔ میں اکیلا بڑی آسانی سے ایس پی صاحب سے نمٹ سکتا ہوں۔ کیا سمجھے آپ؟ اور یہ مذاق کا وقت نہیں۔ اگر بخاری کے آدمی ہم تک پہنچ گئے تو وہ آپ کا غصّہ بھی اِدھر ہی نکالیں گے" عامر نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

"بھئی، مجھے تو نیند آ رہی ہے۔ کسی وقت تو چین کی نیند سونے دیا کرو۔ کیوں ہر وقت تنگ کرتے رہتے ہو" کیپٹن علی نے بمشکل اپنی ہنسی پر قابو پایا تھا۔

"ٹھیک ہے، آپ چین کی نیند سوئیں اور ہم ہمیشہ کی نیند سونے سے پہلے اپنے گناہ بخشوا لیں کیونکہ بخاری نے اپنے آدمیوں کو یہی حکم دیا ہوگا کہ ہماری صُورتوں پر نظر پڑتے ہی پہلے ہمیں گولی ماری جائے اس کے بعد اُس کے حضور پیش کیا جائے" عامر نے اُسی لہجے میں کہا۔

"اچھا یار! روتے کیوں ہو۔ یہ بتاؤ بول کہاں سے رہے ہو؟"

"جہنّم سے؟" عامر نے غصّے سے کہا۔

"اچھا جہاں بھی رہو خوش رہو۔ میں تو وہاں آنے سے رہا" کیپٹن علی نے اُسے یہی تاثر دیا جیسے فون بند کرنے جا رہا ہو۔

"جی ہاں۔ آپ یہاں کیوں آئیں گے۔ ہم کافی ہیں جہنم کا ایندھن بننے کے لیے۔ آپ یہاں جنّت کے مزے لوٹیں۔ ہم تو در بدر دھکّے کھائیں گے"

"اب اچھے بچّوں کی طرح بتاؤ گے بھی یا لڑتے ہی رہوگے"

"ہم ٹھکانہ نمبر ۸ پر اپنی قسمت کے فیصلے کے منتظر ہیں"

"اچھا میں آ رہا ہُوں" علی نے مُسکراتے ہوئے فون بند کر دیا۔

ایسے کئی خفیہ ٹھکانے اُس نے شہر میں بنا رکھے تھے، جہاں ضروریاتِ زندگی کا سامان موجود رہتا اور اُن دونوں میں سے اگر کسی کو روپوش ہونا پڑتا تو وہ یہیں آ جاتا تھا۔ علی کو اِس بات کا علم تھا کہ بخاری کے آدمی اُس کی جان نہیں چھوڑیں گے، اور وہی ہُوا، جیسے ہی وہ اپنی گاڑی میں باہر نکلا ایک نیلے رنگ کی کار نے اُس کا تعاقب شروع کر دیا۔ کار میں

موجود شکلوں پر ایک نظر ڈالنے ہی سے اندازہ ہو جاتا ک
کہ یہ پولیس کے ملازمین ہیں۔

کوئی اور موقع ہوتا تو کیپٹن علی انھیں خوب خو
دیتا لیکن اس وقت وہ جلدی میں تھا۔ ایک ایک منٹ قی
تھا اور وانگلے نے یہ دُوسرا وار کیا تھا۔ وانگلے جیسے د
درندے پر ہاتھ ڈالنا بہت ضروری تھا۔ کیپٹن علی جانتا
اُس سے نمٹنے کے بعد ہی وہ ڈاکٹر ٹانگو تک پہنچ سکے گا۔ کچھ
سوچتے ہوئے اُس نے کار کے ٹرانسمیٹر پر آئی جی صاحب سے
رابطہ قائم کیا۔

"بھئی کہاں ہو تم؟ مجھے ایک ضروری کام آن پڑا ہے
میں تو خود تمھیں تلاش کر رہا ہوں۔ فوراً چلے آؤ۔"

"شکریہ جناب، لیکن اب شاید میرے لیے آنا ممکن ن
رہے" علی بولا۔

"کیا مطلب؟"

"میں اِس وقت شاہراہ نمبر ۴ پر جا رہا ہوں اور ایک
نیلی کار میں پولیس کپتان جناب بخاری صاحب کے ملازم میرا
تعاقب کر رہے ہیں۔ اِن سے جان چھٹے گی تو جناب تک
پہنچوں گا۔"

"اوہ! تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ابھی تک باز

نہیں آیا۔ ٹھہرو ذرا اس کا دماغ ٹھیک کرتا ہوں۔ یہ تو حد سے
بڑھتا جا رہا ہے" آئی جی صاحب نے کہتے ہوئے سلسلہ منقطع
کر دیا اور کیپٹن علی ہیلو ہیلو ہی کرتا رہ گیا۔ یوں محسوس ہوتا
تھا جیسے اُنھیں بخاری کی اس حرکت پر بہت زیادہ غصّہ
آگیا ہے۔

انھوں نے اب اُسی ٹرانسمیٹر پر بخاری کی خبر لی تھی
جس نے بادلِ نخواستہ اپنے ہونہار شاگردوں کو کیپٹن علی کے
تعاقب سے منع کر دیا اور اُس کی جان نیلی کار سے چھوٹ گئی
تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ اُس محفوظ ٹھکانے پر پہنچ گیا
جہاں سرکس کے فن کار اپنے تیسرے ساتھی ولیم کے ساتھ اُس
کے منتظر تھے۔

وہ لوگ کافی دیر تک صورتِ حال پر بحث کرتے
رہے۔ ولیم نے اپنا عندیہ ظاہر کیا تھا کہ وانگلے نے مُلک
کی جنوبی پہاڑیوں میں ہی کہیں اپنا ہیڈکوارٹر قائم کر رکھا
ہے جہاں وہ اس پُر اسرار اور خطرناک شے کی تیاری میں
مصروف ہے جس کے ذریعے وہ تخریب کاری کے ایک بڑے
منصوبے پر عمل کرنے والا ہے۔ اس بات کی اطلاع تو
اُن کو مل ہی چکی تھی کہ وانگلے کی خدمات کچھ غیر ملکی حکومتوں
نے حاصل کر کے اُسے لمبی رقم دی ہے تاکہ وہ کیپٹن علی کے

ملک میں تباہ کاری کے منصوبے پر عمل پیرا ہو سکے۔ وانگلے یہاں اپنی مرضی کی حکومت قائم کرکے ذاتی مفادات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

○

ایس پی بخاری ابھی ابھی آئی جی کا ٹیلی فون سُن کر غصّے میں کھولتا ہُوا باہر نِکلا تھا۔ آئی جی صاحب نے اُسے بے بھاؤ کی سُنائی تھیں اور سختی سے تنبیہہ کی تھی کہ کیپٹن علی کے معاملات میں مداخلت نہ کی جائے۔ ابھی اُسے وہاں کھڑے دو تین منٹ ہی گزرے تھے کہ اُس کے سیکرٹری نے ایک ماتحت کے فون کی اطلاع دی جسے بخاری نے کیپٹن علی کی کوٹھی کی نگرانی پر لگا رکھا تھا۔

"ہیلو!" اُس نے غصّے سے پھنکارتے ہُوئے پُوچھا۔

"جناب والا! میں انسپکٹر جمشید بول رہا ہوں۔ میں نے تین مفروروں میں سے ایک کو ابھی ابھی کیپٹن علی کی کوٹھی سے برآمد ہوتے دیکھا ہے۔"

"جہنم میں جاؤ کیپٹن علی اور تم بھی۔ اُن پر لعنت بھیجو اور فوراً واپس لوٹ آؤ" اس نے دھاڑتے ہُوئے اپنے ماتحت کو حکم دیا۔

"لیکن جناب، آپ نے مجھے خود ہی نگرانی کا حکم دیا

تھا!" انسپکٹر نے حیران ہوکر جواب دیا۔

"میں ہی تمھیں یہ حکم بھی دے رہا ہوں۔ سمجھے تم...؟"

اس نے بغیر جواب سُنے فون کا رسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

دُوسری طرف انسپکٹر ہکا بکا ٹیلی فون کو گھورتا رہا پھر اُسے اپنی جگہ رکھ کر واپس آفس کی طرف روانہ ہوگیا۔ بے چارہ ساری رات جاگ کر کیپٹن علی کے گھر کی نگرانی کرتا رہا تھا۔ اب گوہرِ مقصود ہاتھ لگا تو ایس پی صاحب نے واپسی کا حکم دے دیا تھا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی آخر یہ کیا چکر ہے؟

ٹیپو غائب ہوگیا

پرتاب نگر سرحدی علاقے کا سب سے بڑا اور مشہور شہر تھا۔ اس شہر کو اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے اپنے ملک ہی میں نہیں، دُنیا بھر میں ایک اہم مقام حاصل تھا۔ ایک تو یہاں کا موسم لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتا سارا سال ٹھنڈا رہتا تھا۔ سال کے دوران یہاں ملکی گھریلو مصنوعات کی ایک نمائش لگا کرتی تھی جسے دیکھنے کے لیے مُلک اور بیرونِ ملک سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ یہاں آیا کرتے تھے۔ جیسے ہی گرمیوں کا آغاز ہوتا، پرتاب نگر کی رونق دوچند ہونے لگتی۔ لوگ گرمی سے بچنے کے لیے ادھر کا رُخ کرتے اور یہاں خاصا وقت گزارنے کے بعد واپس لوٹا کرتے تھے۔

پرتاب نگر میں بلا کی سردی پڑتی تھی!

جیسے ہی سردیوں کا آغاز ہوتا یہاں کی رونق اُجڑنے لگتی۔ تین مہینے تک تو پرتاب نگر دُنیا سے کٹ کر رہ جاتا تھا۔

اس دوران سوائے ہوائی جہاز یا ہیلی کاپٹر کے اور کوئی ذریعہ آمد و رفت نہیں رہتا تھا۔ مقامی لوگ جیپوں کے ٹائروں پر چین چڑھا کر شہر کے اندر آیا جایا کرتے تھے یا پھر آمد و رفت کا واحد ذریعہ خچر تھے۔

پرتاب نگر کے چاروں طرف پہاڑوں کا ایک لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ شہر کا اندرونی رقبہ تو بمشکل بیس بائیس میل تھا باقی سب پہاڑی علاقہ تھا۔ اس پہاڑی علاقے کے متعلق بھی عجیب و غریب روایات مشہور تھیں۔

لوگ اس طرف جانے کی ہمت کم ہی کیا کرتے تھے۔ کیونکہ پرتاب نگر کے پہاڑ جنگلوں میں گھرے ہوئے تھے اور یہ سلسلہ شہر کی حدود کے بعد بہت گھنا ہوتا چلا جاتا تھا۔

ان جنگلوں میں خون خوار درندے رہتے تھے جن میں سے اکثر کبھی کبھی شہر کے نزدیک بھی نظر آجاتے تھے۔ جنگلوں اور پہاڑوں کی دہشت ہی اتنی تھی کہ عام شکاری تو اس طرف کا رُخ ہی کم کیا کرتے تھے۔ اگر کوئی پارٹی شکار کے لیے جاتی بھی تو اُس میں سے ایک آدھ شکاری کم ہی لوٹا کرتا تھا۔

لوگوں میں عجیب و غریب توہمات رواج پانے لگے

تھے۔ واپس لوٹنے والے عموماً کسی نہ کسی پُراسرار شے کی موجودگی کی خبر دیا کرتے تھے۔ کسی کو کچھ نظر آتا اور کسی کو کچھ دکھائی دیتا۔ پرتاب نگر کے لوگوں میں یہ نظریہ جڑ پکڑنے لگا تھا کہ شہر کی شمالی سرحد جہاں کی پہاڑیاں آسمان سے باتیں کرتی دکھائی دیتی تھیں وہاں جنّوں اور بھُوتوں کا مسکن ہے اور اس طرف جانے والا پھر کبھی واپس نہیں آتا۔

عموماً ملک کے خطرناک مجرم مفرور ہو کر ان ہی پہاڑوں میں پناہ لیا کرتے تو ان کے تعاقب میں جانے والی پولیس آج تک شاید ہی کسی ملزم کو گرفتار کر پاتی تھی۔ نہ جانے اِن مجرموں کو زمین نِگل لیتی یا آسمان کھا جاتا تھا۔

غرض پرتاب نگر کا سرحدی علاقہ بڑا آسیب زدہ دکھائی دیتا تھا اور اس طرف کوئی دل گُردے والا ہی جانے کی ہمّت کیا کرتا تھا۔

ہوٹل راکا پوشی پرتاب نگر ہی نہیں بلکہ ملک کے سبھی خوب صُورت ترین ہوٹلوں میں سے ایک تھا۔ عموماً مال دار سیاح اسی ہوٹل میں قیام کیا کرتے تھے۔ شام ڈھلنے پر اس ہوٹل کی بالکونی سے ڈوبتے سُورج کا نظّارہ اتنا خوبصورت دکھائی پڑتا تھا کہ لوگ اسی طرف دوڑے چلے آتے تھے۔

اس مرتبہ ہوٹل کے مکینوں کو ایک اور عجیب و غریب

نظارہ بھی دیکھنے کو مل گیا تھا۔ ایسا پہلی مرتبہ ہُوا تھا۔ اور پرتاب نگر کے باشندے بھی بڑی حیرت سے یہ منظر دیکھنے لگے تھے۔ گزشتہ تین روز سے رات کے دس بجے کے بعد سامنے کی اُونچی اُونچی پہاڑیوں سے ایک تیز اور پُراسرار سی روشنی کی لکیر پھُوٹتی تھی۔ اس کے بعد یہ لکیر ایک اُڑن طشتری میں تبدیل ہو جاتی۔ جس کے رنگ بدلتے رہتے تھے۔ یہ اُڑن طشتری ان پہاڑوں پر اسی طرح رنگ برنگ کی روشنیاں بکھیرنے کے تقریباً آدھ گھنٹے بعد جس طرح پہاڑوں کی گود سے برآمد ہوتی تھی اُسی طرح واپس غائب ہو جایا کرتی۔ یہاں کے مقامی باشندوں نے تو اسے بھی بھُوتوں کا کارنامہ کہنا شرُوع کر دیا تھا۔ کیونکہ ان کے خیال میں یہ بھُوت پربت کے علاوہ اور کسی کا کام نہیں تھا جبکہ پڑھے لکھے لوگ اور ہی قسم کی بات کرتے تھے۔ اُن کے خیال میں یہ کوئی گہرا چکّر تھا۔



کیپٹن علی، عامر، ٹیپو اور ولیم یہاں بھیس بدل کر سیاحوں کی شکل میں آئے تھے۔ اُن کی آمد کے دُوسرے ہی روز یہ کام شرُوع ہو گیا تھا۔

”کہیں اس شیطان کو ہماری آمد کا علم تو نہیں ہو گیا؟ اور وہ ہمیں مرعوب کرنے کے لیے یہ حرکتیں کر رہا ہو۔“ رات

گئے جب وہ لوگ ایک کمرے میں بیٹھے اس صورتِ حال پر بات کر رہے تھے تو ولیم نے عندیہ ظاہر کیا۔

"اِس معاملے پر تو پھر سوچیں گے، زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ مجھے اب یقین ہو گیا ہے کہ وانگلے شیطان انہی پہاڑوں میں چھپتا ہے اور ہمیں اُس کو یہاں پر ہی قابو کرنا ہوگا" علی نے کہا۔

"آپ کریں قابو۔ میں تو کوئی جادو منتر نہیں جانتا جو جنوں اور بھوتوں پر قابو پا سکے۔ مجھے ایک مقامی بوڑھے نے آج قسم کھا کر بتایا تھا کہ اُس نے اپنی آنکھوں سے ایک چڑیل دیکھی ہے۔ جنابِ والا! مجھے تو معاف کیجیے۔ مافوق الفطرت چیزوں سے میں نہیں لڑ سکتا۔ آپ کی البتّہ الگ بات ہے" عامر نے سنجیدگی طاری کرتے ہُوئے کہا۔

"بے فکر رہو۔ اگر کسی بھوت نے انسانی خوراک کی خواہش ظاہر کی تو ہم تمھاری قربانی دے کر کم از کم باقی لوگوں کو تو بچا لیں گے" علی نے بھی اُسی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"کبھی تو اچھا کلمہ منھ سے نکالا کریں۔ مم مم مجھے تو پ پ پہلے ہی...." عامر نے ڈر کے مارے کانپنے کی ایکٹنگ اتنی بے ساختہ کی تھی کہ ولیم قہقہہ لگائے بنا نہ رہ سکا۔

تھوڑی دیر بعد اُس نے سنجیدہ ہوتے ہُوئے کیپٹن علی سے مخاطب ہو کر کہا "جناب، مجھے آپ کی صلاحیتوں پر کامل اعتماد ہے لیکن میں آپ کو آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایسے خطرناک لوگوں سے آپ کو پہلے کبھی پالا نہیں پڑا ہوگا۔ یہ بڑے خطرناک مجرم ہیں۔ سائنس میں تو انھیں کمال حاصل ہے۔ انھوں نے دُنیا کے بہترین سائنس دانوں کو اپنے گروہ میں بھرتی کر رکھا ہے اور ایسے ایسے خطرناک ہتھیار ایجاد کر رکھے ہیں جن کا علم ابھی شاید دُنیا میں بہت کم لوگوں کو ہُوا ہوگا۔ یہ انسان نہیں شیطان ہیں شیطان۔ جنابِ والا، انسانی طاقت سے تو مقابلہ کیا جا سکتا ہے لیکن شیطان سے مقابلہ کرنا انسان کے بس کا روگ نہیں۔"

"دیکھو ولیم، ممکن ہے تمھارا کہنا بجا ہو۔ دُنیا کا ہر مجرم خواہ بڑا ہو یا چھوٹا وہ یہی سمجھتا ہے کہ کوئی اس کو پکڑ نہیں سکتا۔ اُس کا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ لیکن آج تک دُنیا میں ایک بھی مجرم ایسا نہیں جو گرفتار نہ ہُوا ہو۔ جیت بالآخر حق کی ہوتی ہے۔ میرا ایمان ہے کہ وانگلے خواہ کتنا بڑا شیطان کیوں نہ ہو اگر قدرت نے ہمیں اُس کے ٹھکانے تک پہنچا دیا ہے تو اُس کا انجام بھی قریب ہی ہے" علی نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"ہم میں بھی یہی کہنا چاہتا تھا" عامر نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"اچھا، تم کب سے کام کی باتیں کرنے لگے۔ بڑی اچھی اطلاع ہے میرے لیے" علی مسکرایا۔

"کبھی کبھی ایسی غلطی بھی ہو جاتی ہے" عامر نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

"تم گپ شپ لگاؤ میں ابھی آتا ہوں" کیپٹن علی نے وہاں سے اُٹھ کر، ٹیپو کو اپنے نزدیک آنے کا اشارہ کرتے ہوئے، عامر اور ولیم سے کہا۔

عامر اور ولیم تو وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ علی اور ٹیپو دوسرے کمرے میں آ گئے جہاں کیپٹن علی اُسے کچھ سمجھانے لگا۔ ٹیپو بڑی توجہ سے اُس کی باتیں سُن رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ چاروں کھانے کے لیے ڈائننگ ہال کی طرف جا رہے تھے۔



یوں تو راکا پوشی میں عجیب و غریب لوگوں کا آنا جانا لگا ہی رہتا تھا لیکن اُس بوڑھے شخص نے جس کے لمبے لمبے اُلجھے ہوئے بال اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں تھیں، سب کے ساتھ ساتھ کیپٹن علی کی توجہ بھی اپنی طرف مبذول کر لی تھی۔

یہ شخص گزشتہ آٹھ دس روز سے اسی ہوٹل میں قیام پذیر تھا اور اس دوران لوگوں کو مختلف شعبدے دکھا کر اپنا قائل کر چکا تھا۔ اُس نے یہاں آتے ہی ہاتھ دیکھنے اور قسمت کا حال بتانے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا جس کی وجہ سے ملکی اور غیر ملکی سیاحت کی شوقین خواتین تو اس کی گرویدہ ہونے لگی تھیں۔

بات یہیں تک رہتی تو شاید علی اس طرف متوجہ نہ ہوتا لیکن جس روز سے یہاں پُراسرار روشنی کا چکر شروع ہوا اُسی روز سے اس پروفیسر نے لوگوں کو اس روشنی سے ڈرانا دھمکانا بھی شروع کر دیا تھا۔ وہ لوگوں کو بتاتا کہ یہ شیطانی قوتوں کی کارروائی ہے اور اس کے خلاف کوئی کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اگر کسی نے کچھ کرنے کی کوشش کی تو وہ جل کر بھسم ہو جائے گا۔ اُس نے لوگوں کو بتایا کہ اُس کی ساری زندگی سیاحت میں گزری ہے اور ایک مرتبہ اس طرح کی پُراسرار روشنی اُس نے افریقہ کے ایک مُلک میں دیکھی تھی جس کے بعد وہاں بڑی تباہی ہوئی تھی۔ اسی طرح کے کچھ اور واقعات سُنا کر اُس نے لوگوں میں ہراس پیدا کر دیا تھا۔



ٹیپو نے مقامی لوگوں جیسا لباس پہن رکھا تھا۔ اسے کی رات ہی کیپٹن علی نے اس پروفیسر کی خصوصی نگرانی کی

ہدایت کی تھی اور اس وقت وہ ہوٹل کے باہر اُس راستے پر کھڑا تھا جس طرف پروفیسر عموماً صبح سیر کے لیے جایا کرتا تھا۔ اُس کی اس عادت کا علم کیپٹن علی کو ہو چکا تھا کیونکہ اُس نے اپنی آنکھیں اس طرف سے بند نہیں کی تھیں۔ علی نے ٹیپو کو ہدایت کی تھی کہ پروفیسر کا تعاقب کرکے اندازہ لگائے کہ آخر وہ جاتا کس طرف ہے۔

جیسے ہی پروفیسر ہوٹل کے مرکزی گیٹ سے باہر نکلا ٹیپو نے خود کو ایک گھنے درخت کی اوٹ میں چھپا لیا۔ پروفیسر ماحول سے بظاہر بالکل لاتعلق مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بڑبڑاتا ہُوا چلا جا رہا تھا اور ٹیپو بلی کی طرح دبے قدموں سے اس کا تعاقب کر رہا تھا۔

دونوں ہوٹل سے قریباً ڈیڑھ دو میل دُور آ گئے تھے اور اب پروفیسر نے وہ خطرناک حد بندی بھی عبور کر لی تھی جو حکومت نے یہاں قائم کر رکھی تھی اور ایک مخصوص جگہ پر لکھا ہُوا تھا کہ اس سے آگے خطرناک علاقہ ہے۔ لوگوں کو اس طرف جانے کی ممانعت کی گئی تھی۔

پروفیسر نے وہ خطرناک حد بھی عبور کر لی۔ تھوڑے فاصلے پر وہ رُک گیا اور ایک پہاڑی ٹیلے پر بیٹھ کر سستانے لگا۔ ٹیپو اُس سے کچھ فاصلے پر ایک ایسے ہی ٹیلے کی اوٹ میں چُھپا

اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اچانک وہ چونک اُٹھا۔ جس ٹیلے پر پروفیسر بیٹھا تھا اس کے ساتھ ہی شاید کوئی خفیہ مقام ایسا تھا جہاں اُس نے ٹرانسمیٹر چھپا رکھا تھا۔ ٹیپو نے دیکھا پروفیسر نے ایک چھوٹا سا ٹرانسمیٹر وہاں سے نکالا اور کسی سے باتیں کرنے لگا۔

اس کی آواز ٹیپو تک نہیں پہنچ رہی تھی کیونکہ فاصلہ زیادہ تھا۔ اور اس ٹیلے سے باہر نکلنے کا خطرہ ٹیپو مول نہیں لے سکتا تھا۔ عین ممکن تھا اس طرح وہ پروفیسر کی نظروں میں آ جاتا کیونکہ اُس نے اپنا مُنہ اسی ٹیلے کی طرف کیا ہُوا تھا جس کے پیچھے ٹیپو نے پناہ لے رکھی تھی۔

گفت گو کے خاتمے پر اُس نے ٹرانسمیٹر کو دوبارہ وہیں چُھپا دیا اور سگرٹ نکال کر سلگا لیا۔ ٹیپو اُس پر ٹکٹکی جمائے بیٹھا تھا۔ سگرٹ ختم کرکے پروفیسر اُٹھا اور ہوٹل کی طرف واپس چل دیا۔ ہوٹل کے نزدیک پہنچ کر اچانک وہ ایک اور سمت میں گھوم گیا۔

ٹیپو ٹھٹھک کر رہ گیا۔

اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ واپس جا کر کیپٹن علی کو رپورٹ دے یا ابھی پروفیسر کا تعاقب جاری رکھے۔ بالآخر اُس نے تعاقب جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ پرتاب نگر پہاڑیوں

میں گھرا ہوا شہر تھا اور یہاں سڑکیں بھی پہاڑوں کو کاٹ کاٹ کر ہی بنائی گئی تھیں۔ یہاں کے خطرناک موڑ اور اندھی کھائیاں تو بہت خوفناک تھیں، جیسے ہی کسی کا پاؤں پھسلا وہ ہزاروں فٹ گہری کسی کھائی میں جا گرا۔ ٹیپو بہت سنبھل کر پاؤں اُٹھا رہا تھا۔ اپنی دانست میں وہ بڑا محتاط تھا اور یہی سمجھ رہا تھا کہ پروفیسر کو اس تعاقب کا احساس نہیں ہو رہا۔

لیکن یہ اس کی خوش فہمی تھی!

یہ لوگ اُن کی توقعات سے بڑھ کر ہوشیار اور خطرناک تھے۔ صبح سے آسمان صاف تھا لیکن اچانک ہی خوفناک گڑگڑاہٹ ہونے لگی اور آسمان بادلوں سے بھر گیا۔ بادل اتنے گہرے تھے کہ ہر طرف اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔ ٹیپو نے گردن گھمائی تو دو مقامی باشندوں کو اپنے پیچھے آتے دیکھا۔ اُس کی چھٹی حس نے فوراً کسی پیش آمدہ خطرے کی نشان دہی کی۔ ٹیپو نے ابھی کچھ سوچا ہی تھا کہ کسی نے اُس کا نام لے کر پکارا۔

ٹیپو نے جیسے ہی گردن آواز کی سمت گھمائی، اُس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ سر پر پڑنے والی ایک ہی ضرب نے اُسے دن میں تارے دکھا دیے تھے۔ ٹیپو چکرا کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔

O

اس کی آنکھ ایک ایسے کمرے میں کھلی تھی جس کے

چاروں طرف دیواریں ہی تھیں کوئی دروازہ اس میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ٹیپو فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ سب سے پہلے بے ساختہ اُس کا ہاتھ اپنے سر کی طرف بڑھا۔ اُس کے سر پر ایک اور ننھے سے سر کا اضافہ ہو گیا تھا۔ ٹیپو نے خدا کا شکر ادا کیا کہ سر پھٹا نہیں تھا لیکن چوٹ والی جگہ پر ابھی تک درد ہو رہا تھا۔

اُس نے اپنی جگہ لیٹے لیٹے گردن گھما کر ماحول کا جائزہ لیا۔ کمرے میں صرف ایک بجلی کا بلب چھت سے لٹک رہا تھا اور اس کا بٹن بھی شاید باہر ہی تھا۔ چھت کا فاصلہ زمین سے کم از کم ۲۰ فٹ تو ضرور رہا ہوگا اور کمرے میں ہوا کے لیے جو واحد روشن دان لگایا گیا تھا وہ بھی پندرہ فٹ کی بلندی پر لگا ہوا تھا۔ گویا یہاں سے فرار کا ہر ممکن راستہ بند کر دیا گیا تھا۔

ٹیپو ایسی صورتِ حال سے گھبرانے والا نہیں تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی اس نوعیت کے حالات کا سامنا کر چکا تھا۔ اُسے تو صرف ایک ہی فکر لاحق تھی کہ کیپٹن علی کو آخر کس طرح پروفیسر کے متعلق خبر پہنچا سکے گا۔ کیونکہ یہاں سے پیغام رسانی کا کوئی بھی ذریعہ ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔

ایک بات اُس کے لیے باعث اطمینان ضرور تھی کہ آخر وہ پروفیسر کا تعاقب کرتا ہوا ہی غائب ہوا ہے۔ اور جب وہ

واپس ہوٹل نہیں پہنچے گا تو علی کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوگا کہ ٹیپو کہاں ہے۔ ظاہر ہے وہ اس طرح یہی سوچے گا کہ ٹیپو وانگلے کے ہتھے چڑھ گیا ہے اور پروفیسر کا وانگلے کے گروہ سے ہی تعلق ہے۔

ٹیپو یہ سوچ کر مطمئن ہو رہا کہ علی اس کے حال سے باخبر ضرور ہے۔ اُس نے اب مزید لیٹے رہنا مناسب نہ سمجھا اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر کھڑے ہو کر اُس نے اپنے ہاتھ پاؤں ہلا کر اس بات کا یقین کر لیا کہ اُس کے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔ اب وہ دیواروں پر ہاتھ پھیر کر بظاہر وہ خلا تلاش کر رہا تھا جس کے راستے یہاں سے باہر نکلا جا سکے۔ کیونکہ اُس کے خیال میں دیواروں میں ہی کوئی راستہ ضرور موجود تھا۔

اچانک ایک گڑگڑاہٹ پیدا ہوئی اور ٹیپو گڑبڑا کر رہ گیا۔ بالکل ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے لاؤڈ سپیکر ٹسٹ کیے جا رہے ہوں۔

ٹیپو ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں اب ایک آواز گونجنے لگی تھی:

"خوش آمدید ننھے شیطان! بالآخر تم ہوش میں آ گئے ہو۔ مجھے بہت دیر سے تمہاری تلاش تھی لیکن افسوس ابھی تم سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔ مجھے تمہارے دونوں ساتھیوں اور

اس غدار ولیم کی بھی تلاش ہے۔ جب تم چاروں اکٹھے ہو جاؤ گے تو میں تم سے مشترکہ ملاقات کروں گا۔ اور ہاں، زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرنا۔ یہاں سے بھاگنے کا تو تصوّر ہی ذہن سے نکال دو۔ میرے ساتھی کسی کو گرفتار کرنے کا خطرہ کم ہی مول لیا کرتے ہیں۔ ہم عموماً بھاگنے کی کوشش کرنے والوں کو گولی مار دیا کرتے ہیں۔ تمہارا واسطہ کسی بیوقوف مجرم سے نہیں پڑا، خیال رکھنا۔"

"تم آخر ہو کون؟ یہ سب کیا ہے؟ میں کہاں ہوں؟ مجھے یہاں کون لایا ہے؟ میں تو ہوٹل میں دودھ کا بل لینے جا رہا تھا، کوئی مجھے بے ہوش کر کے یہاں لے آیا۔ مجھ غریب سے تم آخر کیا چاہتے ہو؟" ٹیپو نے اپنی اداکاری کے جوہر دکھاتے ہوئے کہا۔

اس کے جواب میں ایک خوف ناک قہقہہ بلند ہوا۔

"بے وقوف لڑکے! میں نے تم سے کہا ہے، زیادہ چالاکی نہ دکھانا۔ تم کون ہو، ہمیں اس کا بخوبی علم ہے۔ ہم کون ہیں تم بہت جلد یہ بھی جان جاؤ گے۔ ابھی تو اپنے ساتھیوں کا انتظار کرو۔ میں چاہتا ہوں تم سب کو اکٹھے کر کے یہ خوشخبری سناؤں کہ میں کون ہوں!" آخر میں پھر وہی قہقہہ بلند ہوا۔

جواب میں ٹیپو نے رونے کی اس طرح ایکٹنگ کی

جیسے وہ واقعی ٹیپو کے بجائے کوئی اور ہو اور وہ لوگ ٹیپو کے دھوکے میں اُسے گرفتار کر کے لے آئے ہوں۔ لیکن اس مرتبہ اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ بالآخر ٹیپو بھی رو دھو کر چُپ ہو رہا۔ اُس کا جسم پتھر کے فرش پر مسلسل لیٹے رہنے سے اب درد کرنے لگا تھا۔ یہاں وقت کا احساس تو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ نہ جانے وہ کتنی دیر تک بے ہوشی کی حالت میں یہاں لیٹا رہا تھا۔ ٹیپو نے اپنے آپ پر یہ احساس ہی طاری نہیں ہونے دیا کہ اُس کا جسم درد ہو رہا ہے — اور کروٹ لے کر لیٹ گیا۔

ابھی اُسے لیٹے بمشکل پانچ دس منٹ ہی گزرے تھے کہ اچانک ایک خوف ناک گڑگڑاہٹ پھر سنائی دی۔ ٹیپو نے اس مرتبہ اُٹھنے کا تکلف نہیں کیا۔ کیوں کہ وہ جان گیا تھا کہ ان لوگوں نے اس کی کسی بات پر اعتبار نہیں کرنا۔ لیٹے لیٹے اُس نے دیکھا، اُس کے سامنے والی دیوار اپنی جگہ سے سرک رہی ہے۔ پھر دیوار غائب ہوئی تو سامنے خلا میں ایک بڑا ہال نما کمرہ دکھائی دیا اور دو مسلح شخص اُسے اپنی طرف آتے دکھائی دیے۔ اُن میں سے ایک تو دروازے پر ہی کھڑا ہو گیا دُوسرا اُس کے پاس آ گیا۔

"اُٹھو اور ہمارے ساتھ چلو" آنے والے نے اُسے حکم دیا۔

"لیکن اُٹھوں کیسے؟ مجھ سے تو ہلا نہیں جاتا" ٹیپو نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

"تمہیں بتاؤں کوئی طریقہ؟" آنے والا غُرّایا۔

"کون سا طریقہ بھائی؟ کوئی بھی طریقہ بتاؤ۔ مہربانی سے اُٹھا دو۔ نہ جانے کمبختوں نے مجھے کتنا مارا ہے۔ میرا تو سارا جسم درد کرنے لگا ہے" ٹیپو نے لیٹے لیٹے کراہتے ہُوئے کہا۔

دراصل اس طرح وہ وقت ضائع کر کے ماحول کا جائزہ لے رہا تھا اور اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ آخر یہاں کتنے لوگ موجود ہیں۔ اُس نے سامنے ہال کا دروازہ دیکھ لیا تھا اور دل ہی دل میں یہاں سے فرار کا منصوبہ بھی بنانے لگا تھا۔ حالانکہ بظاہر یہ ممکن نہیں تھا لیکن مایوس ہونا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

"اُٹھو" سٹین گن والے نے اُس کو ٹھوکر مارتے ہُوئے کہا اور ٹیپو کراہتا ہُوا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"چلو آگے" دُوسرا حکم ملا۔

"لیکن کس کے آگے؟" ٹیپو نے منہ بسورتے ہُوئے کہا۔

دُوسرا نقاب پوش جو ابھی تک دیوار کے باہر کھڑا تھا اُس کے آگے آگے چلنے لگا۔ اب صُورت ایسی ہی تھی کہ ایک مسلح شخص ٹیپو کے آگے چل رہا تھا اور دُوسرا کچھ فاصلے پر

پیچھے آ رہا تھا اور اِن دونوں کے درمیان ٹیپو چل رہا تھا
ہال میں داخل ہونے کے بعد وہ لوگ باہر جانے والے دروا
کی طرف چل دیے۔

جیسے جیسے دروازہ قریب آ رہا تھا ٹیپو اپنے ذ
میں طے شدہ منصوبے کے مطابق اپنی رفتار سست کرتا جا ر
تھا۔ اس طرح دراصل وہ اپنے اور اپنے پیچھے آنے والے
درمیان فاصلہ کم کرنا چاہتا تھا۔

پہلا نقاب پوش دروازے سے باہر نکل چکا تھا اور
ٹیپو دروازے کے نزدیک تھا۔ جبکہ اُس سے بمشکل تین چا
قدم کے فاصلے پر دُوسرا نقاب پوش تھوڑی دیر بعد ٹوٹنے وال
قیامت سے بے خبر چلا آ رہا تھا۔ دروازے کے عین نزدیک
ٹیپو اس طرح لڑکھڑایا جیسے اس کا پاؤں کسی غلط جگہ پر
آ گیا ہو۔

اسی اثنا میں اُس کے تعاقب میں آنے والا نقاب
پوش بالکل اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ جیسے ہی وہ دروازے
کے نزدیک پہنچا، ٹیپو جو زمین پر گرا ہُوا تھا، نے دروازے
کا ایک پٹ پوری قوت سے اُس کے پیٹ میں مارا۔ یہ
حملہ اتنا اچانک اور بھرپور تھا کہ بے خبر نقاب پوش لڑکھڑایا
اور مُنہ کے بل زمین پر آن پڑا۔ اگر دروازے کے باہر والا

پوش اچانک گولی بھی چلا دیتا تو وہ ٹیپو کو نہ لگتی
نکہ وہ حملے کے پیش نظر پہلے ہی زمین پر بیٹھ چکا تھا۔

دُوسرا نقاب پوش اس اچانک صورتِ حال سے بوکھلا
ٹیپو کی طرف لپکا۔ شاید وہ لوگ گولی چلانے میں احتیاط
رہے تھے۔ ٹیپو نے لیٹے لیٹے اپنی دونوں ٹانگیں جوڑ کر
اپنے پاؤں پوری قوت سے اُس کے ٹخنوں پر مارے تو
منہ کے بل زمین پر جا گرا۔ یہ اس کا خاص داؤ تھا جس
کیپٹن علی نے ٹیپو کو خصوصی مشق کروائی تھی۔ زمین پر
پڑے ہوئے نقاب پوش کی کنپٹی پر ٹیپو نے اپنے پاؤں کی
ری اتنی قوت سے ماری کہ اُس کے اُٹھنے کے چانسز باقی
نہیں رہے تھے۔

ہال کے باہر میدانی علاقہ تھا اور تین چار فٹ کی ایک
وں کی چار دیواری سے اُسے الگ شکل دی گئی تھی۔ ٹیپو
دوسرے ہی لمحے بھاگ کھڑا ہُوا۔ بھاگتے ہُوئے اُس نے
چار دیواری عبور کر لی۔ ابھی بمشکل چند قدم ہی وہ آگے نکلا
گا کہ اپنے تعاقب میں اُسے فائرنگ کی آوازیں سُنائی دیں۔
لیکن گھبرانا تو اُس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

بھاگتے بھاگتے وہ اچانک جُھک گیا اور اب ماہر
رجیوں کی طرح قدرے ترچھا ہو کر بھاگنے لگا۔ اس سے

آگے پہاڑی راستہ تھا۔ ٹیپو کو اپنے دائیں ہاتھ ہوٹل کی بلڈنگ
صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اُن
لوگوں کا ٹھکانہ کہیں قریب ہی تھا۔

پہاڑیوں میں گولی آواز خاصی گونج پیدا کرتی ہے۔ شا
اس خدشے کے پیشِ نظر اب اُن لوگوں نے فائرنگ تو بند
کر دی تھی لیکن اُس کو اپنے تعاقب میں دوڑتے قدموں کی
آوازیں صاف سُنائی دے رہی تھیں۔ ٹیپو کا بدن بُری طرح
دُکھنے لگا تھا اور آڑے ترچھے، اُونچے نیچے راستوں پر
بھاگتے ہُوئے اب وہ خاصی تھکاوٹ بھی محسوس کرنے
لگا تھا۔ وہ دل ہی دل میں دُعا کر رہا تھا کہ فائرنگ کی
آواز سُن کر کوئی اُس کی مدد کو آجائے لیکن بظاہر کوئی
آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔

اچانک ایک ترکیب اُس کے ذہن میں آئی اور
اس نے سیدھے بھاگنے کے بجائے پہاڑی کے دامن میں
چکر کاٹ کر اُس پر چڑھنا شروع کر دیا۔ پہاڑی پر پہنچ کر
وہ بے دم سا ہو کر گر پڑا اور ہانپنے لگا۔ اُس کے اندازے
کے عین مطابق تعاقب میں آنے والے اندازے کی غلطی کا
شکار ہو چکے تھے اور بجائے پہاڑی کی طرف متوجہ ہونے
کے وہ پہاڑی راستے پر ہی بھاگتے چلے گئے۔ ٹیپو نے

جب وہ آگے نکل گئے تو وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور
کی دُوسری سمت سے اُس سڑک کی طرف روانہ ہو گیا
نگر کی واحد بارونق سڑک کہلاتی تھی۔ سڑک پر
کی آمد و رفت جاری تھی۔ ایک ٹیکسی کے ذریعے وہ
کی طرف روانہ ہو گیا۔

○

ٹپو کو گئے آج دُوسرا دن تھا اور ابھی تک اُس کی
خبر نہیں تھی۔

عامر بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ علی بھی
پریشان تھا لیکن اُس نے اپنے تأثرات چھپا رکھے تھے۔
امید تھی کہ اِس کا ہونہار شاگرد ضرور اُن لوگوں کے
سے نکل جائے گا جنھوں نے اُسے قابو کیا ہوگا۔

دونوں اس وقت ہوٹل کے لان میں بیٹھے تھے۔ ولیم
کمرے میں تھا۔ وہ بہت کم باہر نکلتا تھا۔ شاید اُسے
تک یہی خوف دامن گیر تھا کہ دانگلے اُسے یہاں بھی
مروا ڈالے گا۔

"اب یہاں بیٹھے بیٹھے مکھیاں ہی ماریں گے یا کچھ
کرنے کا ارادہ بھی ہے" عامر نے زچ ہو کر کہا کیوں کہ
نے اُسے ہوٹل سے باہر نکلنے کی ممانعت کر دی تھی۔

"کہاں ہیں مکھیاں ؟" علی نے فضاؤں میں گھورتے ہوئے کہا۔

"آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے اور میری جان پر بنی ہے" عامر بولا۔

"دیکھو، اور انتظار کرو" کیپٹن علی نے ہاتھ اُٹھا کر بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"مجھے آپ کی اس تھیوری سے کبھی اتّفاق نہیں رہا" عامر چڑ کر بولا۔

"اِس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"کمال ہے۔ کیا یہاں اِنتظار کرتے مر جائیں؟"

"تم ابھی نہیں مر سکتے" علی نے آنکھیں بند کر کے جوگیوں کے سے انداز میں کہا۔

"جی ہاں، مجھے بھی یہی بشارت ہوئی تھی۔ لیکن میں اس چکر میں آنے والا نہیں۔"

دونوں میں نوک جھونک جاری ہی تھی جب انھوں نے لان کے سامنے ایک ٹیکسی کو رُکتے دیکھا جس میں سے ٹیپو باہر نکلا۔ وہ لڑکھڑا کر چل رہا تھا۔ بہت سے لوگ اُس کی طرف لپکے۔ عامر نے بے قراری سے بڑھ کر اُسے تھام لیا اور سہارا دے کر کرسی تک لے آیا۔ اسی دوران

علی نے ٹیپو کا کندھا دبا کر ایک مخصوص اشارہ کر دیا تھا۔

"میں راستہ بھول گیا تھا اور ایک پہاڑی ڈھلان سے پڑا تھا۔ اب بالکل ٹھیک ہوں" اُس نے لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے بہانہ کر دیا۔

تینوں لوگوں کے سوالات سے بچنے کے لیے اب کمروں میں چلے آئے تھے۔ جہاں علی نے ٹیپو کو بستر پر لٹا کر آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ خود بھی اُسی کمرے اُس کے سرہانے بیٹھا رہا۔ عامر کو اُس نے ولیم کے کمرے بھیج دیا تھا۔

جادو نگری

شام تک ٹیپو نارمل ہو چکا تھا۔

اس نے علی کو تمام تفصیلات سے آگاہ کر دیا تھا۔ علی نے اُس کی بہادری پر اُسے شاباش دی۔ واقعی ٹیپو نے بہادری دکھائی تھی ورنہ ایک مرتبہ وانگلے کے چنگل میں پھنس کر نکلنا کوئی بچّوں کا کھیل نہیں تھا۔

"لیکن وہ پروفیسر تو نکل گیا۔ اُسی کے ذریعے ہم وانگلے تک پہنچ سکتے تھے" ولیم نے تشویش ظاہر کی۔

"نہیں، وہ ہمارے قبضے میں ہے۔ میں نے تمھیں بتایا نہیں کہ پہلے ہی روز سے میری نظر اس پر تھی۔ پرتاب نگر میں میرے آدمیوں نے اس کی مشکوک سرگرمیوں کی رپورٹ مجھے دے دی تھی لیکن میں اُسے ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ ٹیپو کی گرفتاری کے بعد ہمیں مجبوراً اُس پر قابو پانا پڑا۔ اُس نے ایک دو اور کام کی باتیں بھی بتائی ہیں۔

جہاں پرتاب نگر میں ہم نے اِن لوگوں کے دو اور ٹھکانے بھی تلاش کیے لیکن اب کوئی فائدہ نہیں۔ وہ لوگ وہاں سے نکل چکے ہیں" علی نے جواب دیا۔

ولیم حیرت سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس نے آج تک ایسا محتاط، ذہین اور بہادر آفیسر نہیں دیکھا تھا۔

"ہمیں تو آپ نے ظاہر ہے جھک مارنے کے لیے ہی بلایا ہے" عامر منہ بسورتے ہوئے بولا۔

"میں سمجھا نہیں" علی نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

"جب آپ کو ان لوگوں کے ٹھکانوں کا علم تھا۔ اور آپ نے چوری چھپے دو تین کارنامے بھی سرانجام دے دیے تھے تو آخر ہمیں زحمت دینے کی کیا ضرورت تھی؟"

"اوہ، تو یہ بات ہے۔"

"جی ہاں، آپ کے لیے تو ظاہر ہے ایسی باتوں کی کوئی اہمیت کبھی رہی ہی نہیں۔"

"اچھا بھئی، اب خاموش ہو جاؤ۔ اچھے بچے اس طرح معمولی باتوں پر رویا نہیں کرتے اور وقت سے پہلے کسی چیز کا استعمال بھی نہیں کیا جاتا۔ اصل کھیل تو اب شروع ہونے والا ہے۔ بس تم لوگ ایک خطرناک سفر کی تیاریاں شروع کر دو" علی بولا۔

"دیکھیے جناب، یہ مجھے دوائیوں کی طرح وقت سے پہلے اور وقت سے بعد استعمال نہ کیا کریں۔ میں کوئی انجکشن یا ٹیبلٹ نہیں ہوں" عامر بولا۔

"بھئی یہ دوائیوں کا ذکر یہاں کیوں لے آئے؟"

"اب انھی کی ضرورت پیش آئے گی۔ ظاہر ہے جس سفر پر آپ لے جا رہے ہیں ہمیں، وہ کوئی آرام دہ سفر تو ہوگا نہیں۔"

عامر کی بات پر سب ہی مُسکرا دیے۔

○

معمول کے مطابق آج بھی راکا پوشی کی چھت اور بالکونیاں سیاحوں سے بھری پڑی تھیں لیکن آج ذرا مختلف تماشہ ہو رہا تھا۔ جیسے ہی روشنی کی اُڑن طشتری نمودار ہوئی آسمان ایک جنگی ہیلی کاپٹر کی آواز سے گونجنے لگا۔ پھر لوگوں نے شمال کی سمت سے آرمی کے ایک ہیلی کاپٹر کو اس طرف آتے دیکھا۔ شاید فوج نے اس پر حملے کا اِرادہ کر لیا تھا۔

کیپٹن علی، عامر، ٹیپو اور ولیم بھی اپنے کمرے کی بالکنی سے یہ نظارہ کر رہے تھے۔ ہیلی کاپٹر تیز رفتاری سے اڑن طشتری کی طرف بڑھ رہا تھا۔

کچھ فاصلے پر پہنچ کر اُس نے روشنی کے گرد ایک چکّر کاٹا۔ شاید اپنے نشانے کا تعیّن کر رہا تھا۔ لوگوں نے

دھڑکتے دل سے ہیلی کاپٹر کی گنوں کو ایکشن میں آتے ہیں۔ پھر ہیلی کاپٹر کی گنوں سے گولیاں نکلنے لگیں۔ گولیوں کے سُرخ شعلے ایک لکیر بناتے اُس طرف لپک رہے تھے جہاں اچانک ہی اُڑن طشتری کے گرد ایک اور رنگ کی روشنی کا ہالہ سا بن گیا۔ یہ بڑا دلچسپ اور عجیب منظر تھا۔ ابھی لوگ مبہوت سے کھڑے تھے کہ اچانک ان کی چیخیں نکلتے نکلتے رہ گئیں۔

بات ہی کچھ ایسی ہوئی تھی۔ طشتری سے سُرخ رنگ کی ایک لیزر نما شعاع نکلی اور ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھی۔ دوسرے ہی لمحے ہیلی کاپٹر ایک زوردار دھماکے کی آواز سے پھٹ گیا۔ بالکل ایسے جیسے کسی بچے نے غبارے کو پھاڑ دیا ہو۔ لوگ سہم کر رہ گئے۔

"اُف میرے خدایا! اِن لوگوں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے" علی بڑبڑایا۔ ابھی اِس نے اپنی بات بمشکل مکمل کی تھی کہ آسمان پر ایک دھاڑ گونجی۔ اس مرتبہ ایئر فورس کا ایک جہاز اسی طرف آ رہا تھا۔

"یہ لوگ کیوں مرنے پر تلے ہُوئے ہیں، انھیں روکیے" — بے ساختہ عامر کے مُنھ سے نکل گیا۔

علی غصّے اور افسوس کی ملی جُلی کیفیت سے ہاتھ مل کر رہ گیا۔

اس وقت وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا جب تک وہ کسی کو پیغام پہنچاتا یا حکم دیتا۔ طیارے کا کھیل ختم ہو چکا ہوتا۔

طیارے کا پائیلٹ بڑا منجھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے یک دم طیارے کو سیدھا کیا اور اُڑن طشتری سے کافی بلندی پر لے گیا۔

اس کے ساتھ ہی پرتاب نگر کی پہاڑیاں ایک زوردار دھماکے آواز سے لرزنے لگیں۔ ہوا باز نے خاصی بلندی سے طشتری پر بم گرایا تھا۔ ابھی اس دھماکے کی گونج باقی ہی تھی کہ ایک اور زوردار دھماکہ ہوا۔ اس مرتبہ بے ساختہ لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔

بالکل پہلے سے انداز میں اُڑن طشتری سے ایک شعاع نکلی۔ طیارے کے پائیلٹ نے اپنی دانست میں نکل جانا چاہا لیکن اُسے مہلت نہ مل سکی۔ لیزر شعاع برق رفتاری سے طیارے پر لپکی اور اُسے بھسم کر کے رکھ دیا۔ علی نے دیکھا کہ طیارے کے ہوا باز نے عین آخری لمحات میں ایجیکٹ کر لیا تھا۔ کیونکہ اُس نے ہوا باز کا چھاتہ کھُلتے دیکھ لیا تھا۔ اُس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کم از کم پائیلٹ کی جان تو بچ گئی۔ طیارہ جس میں لیزر نے آگ لگا دی تھی، پہاڑیوں سے ٹکرایا اور زوردار دھماکے کی آواز سے پھٹ گیا۔

"اب اس کھیل کو ختم ہونا چاہیے" علی نے آہستہ سے کہا اور وہ بھاگتا ہوا ہوٹل کے ٹیلی فون ایکس چینج کی طرف جانے لگا۔

چند منٹ بعد ہی اُس نے اعلیٰ حکام سے رابطہ کر کے انہیں سختی سے ممانعت کر دی تھی کہ اب کوئی جہاز اس طرف نہ بھیجا جائے۔

صورتِ حال اتنی خوف ناک تھی کہ آدھا ہوٹل تو اُسی وقت خالی ہو گیا۔ لوگ پرتاب نگر کو چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ ان کے دلوں پر اُس اُڑن طشتری نے عجیب و غریب ہیبت طاری کر دی تھی۔ دُوسرے روز علی الصباح کچھ اور لوگ بھی نکل گئے۔

اب ہوٹل میں چند گنے چُنے سیاح ہی رہ گئے تھے۔ یہ یہی وہ لوگ تھے جو بہت نڈر تھے یا ایڈونچر کے شوقین معلوم ہوتے تھے اور کوئی نیا ہنگامہ دیکھنے کے لیے رُک گئے تھے۔



ہیلی کاپٹر اور طیارے کی تباہی آغاز تھی۔ اس کے بعد پے در پے خطرناک حادثات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ حادثات بڑے عجیب و غریب نوعیت کے ہوتے تھے۔ کبھی چلتے چلتے کوئی جیپ یا کار کا ٹائر پھٹ جاتا اور وہ اُلٹ جاتی۔ کبھی کوئی

کار دھماکے سے اُڑ جاتی۔ پہاڑیوں سے اُکا دُکا لاش برآمد ہونا تو روزانہ کا معمول بن چکا تھا۔

حیرت کی بات تو یہ تھی کہ یہ واقعات صرف سرکاری افسران کو پیش آتے تھے۔ بہت کم عام شہری ان حادثات کا شکار ہوئے تھے۔ اِن پے در پے حادثات نے سرکاری ملازمین کے دلوں پر ایسا خوف و ہراس طاری کر دیا کہ وہ لوگ گھروں سے نکلتے ہوئے ڈرنے لگے۔ سارا سرکاری کاروبار چوپٹ ہو کر رہ گیا۔

پرتاب نگر کے اکثر سرکاری ملازمین چھُٹیاں لے کر یہاں سے چلے گئے تھے۔ جنھیں چھُٹیاں نہ مل سکیں اُنھوں نے اپنے بیوی بچوں کو پرتاب نگر سے باہر بھیج دیا۔

سارے شہر پر خوف و ہراس طاری تھا۔ پرتاب نگر میں اس موسم میں تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی لیکن اب یہاں کے ہوٹل، گلیاں اور بازار بھائیں بھائیں کرنے لگے تھے۔ دُور دراز تک کسی ذی ہوش کا نام و نشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ دکانیں سنسان پڑی تھیں۔ مقامی آبادی کے لوگ دھڑا دھڑ نزدیکی شہروں کو منتقل ہو رہے تھے۔

صورتِ حال اتنی مخدوش ہو گئی تھی کہ آرمی نے پرتاب نگر میں کنٹرول سنبھال لیا اور اب یہاں سوائے باوردی اور مسلّح فوجیوں کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یُوں محسُوس ہونے لگا

تھا جیسے کوئی پُراسرار قوت اس شہر کو خالی کروانے پر تُل گئی ہے۔

ایک طرف تو حالات یہ تھے کہ کوئی شخص گھر سے باہر نہیں نکل رہا تھا لیکن دُوسری طرف صُورت حال بالکل اُلٹ تھی۔ اس روز آرمی کے جوانوں نے شکاریوں کی ایک ٹولی کو دیکھا جس میں ایک کم عمر کا لڑکا اور تین نوجوان شکاری شامل تھے۔ یہ لوگ پہاڑیوں میں شکار کھیلنا چاہتے تھے۔

"تم لوگ پاگل ہو گئے ہو۔ یہ حالات شکار کے لیے موزوں نہیں" ایک آرمی آفیسر نے اُنھیں سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"جناب، اگر ہمیں کل تک شکار نہ ملا تو ہم واقعی پاگل ہو جائیں گے۔ کیونکہ یہی ہمارا ذریعہ آمدن ہے اور اب نوبت یہ آگئی ہے کہ ہم اُدھار مانگ کر گزارہ کر رہے ہیں بلکہ اب تو لوگوں نے ہمیں اُدھار دینا بھی بند کر دیا ہے۔ بالکل فاقوں کی نوبت آگئی ہے۔ ہمیں مت روکیے۔ خدارا ہمیں جانے دیجیے" ایک شکاری نے، جو یقیناً عامر ہی تھا، کہا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں جانتے بوجھتے تمھیں کیسے موت کے منھ میں جانے کی اجازت دے دُوں" اُس آفیسر نے کہا۔

"یار، تُم کیوں ہمارے پیٹ کے دشمن ہو رہے ہو" وہی شکاری بولا۔

"اچھا، تم ایسے کرو ہمیں اپنے افسرِ اعلیٰ کے سامنے پیش

کر دو" دوسرے شکاری نے کہا۔

آفیسر نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا، پھر شاید اُسے اپنی جان چھڑانے کا یہی طریقہ بہتر لگا۔

"اچھا چلو۔ لیکن صرف ایک آدمی میرے ساتھ آئے۔"

"ٹھیک ہے" علی نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد کیپٹن علی کو اس آفیسر نے اپنے اعلیٰ افسر کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا "سر، یہ لوگ آگے جانے پر بضد ہیں۔"

"کون ہیں آپ لوگ؟" افسرِ اعلیٰ نے پوچھا۔

"جواب میں علی نے منہ سے دو تین کلمات ہی ادا کیے تھے کہ اُس کا ہاتھ بے اختیار سلیوٹ کے لیے اُٹھ گیا۔

"سر! آپ" اُس نے علی سے کہا۔ اور وہ افسر جو اُسے یہاں تک لایا تھا، حیرانگی سے دیکھنے لگا۔

"آفیسر، میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ بھید کسی پر کُھلے۔ معاملہ بہت سنگین ہے۔ میری بھی درخواست ہوگی کہ یہ بات یہیں تک ہی محدود رہنی چاہیے" کیپٹن علی نے اُسے کہا۔

"ایسا ہی ہوگا جناب۔"

"ہمیں اب جانا ہوگا" علی نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا "حالات روزانہ بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔"

"واقعی جناب، مُلک پر عجیب مُصیبت آن پڑی ہے۔ ہمیں اُمید ہے اِنشاء اللہ آپ اس کا حل ضرور نکال لیں گے۔ خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔ ہماری دُعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کے ایک اشارے پر ہم سب اپنی جان دینے کو بھی حاضر ہیں۔"

"خدا حافظ" علی نے کہا اور باہر نکل آیا۔



چاروں نے اپنی پُشت پر شکاری تھیلے اُٹھا رکھے تھے اور ہاتھوں میں شکاری رائفلیں پکڑی ہوئی تھیں۔ وہ خطرناک حد کے بھی آٹھ دس میل اندر آچکے تھے لیکن ابھی تک کوئی واقع پیش نہیں آیا تھا۔ رات ڈھلنے لگی تو انھوں نے ایک پہاڑی کے دامن میں خیمہ لگا لیا۔ اب وہ اسی خیمے میں لیٹے آنے والے حالات کے متعلق منصوبہ بندی کر رہے تھے۔

میرے خیال سے کافی چہل قدمی ہو گئی۔ اب واپس ہی چلا جانے تو بہتر ہے" عامر نے اپنے بیگ سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

"سیر کرنا صحت کے لیے فائدہ مند ہے، بُری بات نہیں" علی نے اطمینان سے جواب دیا۔

"الحمدللہ! میں بالکل صحت مند ہوں اور جانوروں کے

بجائے انسانی آبادی میں رہ کر اپنی صحت مزید بہتر بنا سکتا ہوں۔ آپ بڑے شوق سے قیام فرمایئے۔ مجھے کسی جانور کی غذا بننے کا شوق نہیں" عامر بولا۔

"میں آپ کی دماغی صحت کے متعلق کبھی خوش فہمی کا شکار نہیں رہا۔ اس لیے براہِ مہربانی اکیلے واپس جانے کا اِرادہ ترک کر دیجیے" علی نے اُسی لہجے میں کہا۔

تینوں بے ساختہ مُسکرا دیے۔ ولیم کو علی اور عامر کی نوک جھونک سُننے میں بہت مزہ آنے لگا تھا۔ وہ بہت کم گو آدمی تھا۔ مطلب کے بغیر بات نہیں کیا کرتا تھا لیکن عامر نے اُسے خاصا فری کر لیا تھا اور اب وہ وقتاً فوقتاً اُن کے ساتھ گُفتگو میں حصّہ لے لیا کرتا تھا۔

اُسے علم تھا کہ ڈاکٹر ٹانگو کتنا خطرناک انسان ہے۔ وہ انسان کے رُوپ میں ایک درندہ تھا اور دُنیا کی بڑی بڑی حکومتوں کو اُس نے نچا کر رکھ دیا تھا۔ ولیم نے ٹانگو کے ساتھ بہت وقت گزارا تھا۔ اُسے احساس تھا کہ یہ شخص انسانیت کے لیے کتنا بڑا خطرہ ثابت ہوگا۔ اُس نے اپنی آنکھوں سے بڑے بڑے لوگوں کو ٹانگو کے سامنے ایڑیاں رگڑتے دیکھا تھا۔ اب تو کچھ حکومتیں اُسے اپنے غلط مقصد کے لیے بھی استعمال کرنے لگی تھیں۔ لیکن ولیم کا

دل گواہی دیتا تھا کہ اگر دُنیا میں کوئی انسان ڈاکٹر ٹانگو کی گردن پکڑ سکتا ہے تو وہ کیپٹن علی ہی ہے۔

اُس نے ٹانگو کی زبانی علی کے متعلق کئی باتیں سُنی تھیں اور یہاں اُس نے علی کو دیکھ کر اُس کی ذہانت سے متاثر ہونے کے بعد یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ صرف علی ہی ٹانگو کی ٹکر کا آدمی ہے۔

اب وہ لوگ سونے کی تیاریاں کرنے لگے۔ سونے کے لیے اُنھوں نے یہ طریقہ اپنایا تھا کہ باری باری اُن میں ایک شخص پہرہ دیتا اور باقی لوگ سو جاتے۔

رات کا دوسرا پہر تھا۔ عامر پہرہ دے رہا تھا۔ باقی لوگ سو رہے تھے۔ رائفل عامر نے اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام رکھی تھی اور وہ اکڑوں بیٹھا تھا کہ اچانک اُسے یُوں لگا جیسے اُس کے حلق میں خارش ہونے لگی ہو۔ کوئی شے اُسے اپنی ناک میں گھستی محسوس ہوئی۔ بڑی تیز خوشبو تھی۔ ایک آدھ مرتبہ اُس نے کھانسنے کی کوشش کی۔ پھر ناک پر ہاتھ رکھ کر اپنی جگہ سے اُٹھنا چاہا لیکن بدن نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ عامر کو اپنے حواس آہستہ آہستہ دم توڑتے محسوس ہوئے۔ آخری لمحات میں اُسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ اس کو بے ہوش کرنے

کے لیے کسی قسم کی گیس استعمال کی جا رہی ہے لیکن اب وہ صرف سوچ سکتا تھا۔ تیز اثر گیس نے اُس کے جسم کو کسی کام کے لائق نہیں چھوڑا تھا۔ چند سیکنڈ بعد وہ کٹے ہُوئے درخت کی طرح زمین بوس ہو چکا تھا۔

O

اُن سب کو ہوش آیا تو ایک خیمے میں سو رہے تھے۔ سب سے پہلے کیپٹن علی اس گہری نیند سے بیدار ہُوا۔ پھر عامر، ولیم اور ٹیپو بھی جاگ پڑے۔ انھوں نے دیکھا کہ علی ایک کونے میں بیٹھا اپنے سامان کا جائزہ لے رہا ہے۔ اُن کا سامان جوں کا توں وہاں موجود تھا۔ صرف رائفلیں اور ٹرانسمیٹر غائب تھے۔ خیمہ خاصا آرام دہ اور خوب صُورت بنا ہُوا تھا۔

"سُبحان اللہ! اسے کہتے ہیں کرشمہ قدرت۔ کل ہم خاکی خیمے میں سوئے تھے اب سُرخ خیمے میں استراحت فرما رہے ہیں۔ کیا کہنے، مزہ آگیا۔" عامر نے چہکتے ہُوئے کہا۔

"جادُو نگری میں آ پہنچے ہیں عامر میاں، ابھی آگے آگے دیکھیے کیا کیا دیکھنے کو ملتا ہے۔" علی نے اُسے اسی لہجے میں جواب دیا۔

"جی ہاں، لیکن شاید اس جادُو نگری کا حال ہم اپنی دُنیا کے

لوگوں کو کبھی نہ سُنا سکیں۔ کیونکہ یہی سُنا ہے کہ یہاں آنے والا پھر کبھی واپس لوٹ کر نہیں گیا" عامر نے دوبارہ چہکتے ہوئے کہا۔

وہ تینوں مطمئن تھے لیکن کیپٹن علی نے دیکھا ولیم کے چہرے پر پریشانی کے آثار موجود ہیں۔ اُسے شاید احساس ہو چکا تھا کہ وہ لوگ اب وانگلے کے چکر میں پھنس چکے ہیں۔

"آپ کو شاید یہ جگہ پسند نہیں آئی" عامر نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہُوئے کہا۔

"نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں" ولیم کھسیانی ہنسی ہنس دیا۔

وہ لوگ پہلے تو یہی باتیں کرتے رہے پھر علی نے کہا "آؤ باہر کی دُنیا ہی دیکھ لیں۔ ابھی تک تو ہمارا کوئی میزبان بھی ملاقات کرنے نہیں آیا۔"

خیمے سے باہر نکلتے ہی وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ یہ تو ایک مکمل شہر تھا۔ خیموں کا شہر۔ پہاڑ کے دامن میں آباد اس شہر میں چاروں طرف پیلے نیلے اور سُرخ رنگ کے خیمے نظر آرہے تھے۔ خیموں کے ساتھ ساتھ سڑک بھی بنی ہوئی تھی۔ کیپٹن علی ٹانگو کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

اُس نے بڑی شاندار جگہ اپنے گھناؤنے مقاصد کی بجاآوری کے لیے چُنی تھی۔ وہ لوگ ایک پیالہ نما وادی میں کھڑے تھے۔ اُن کے چاروں طرف سربفلک پہاڑ تھے۔ پہاڑوں نے ایک طرح سے ان خیموں پر چھاتہ تان رکھا تھا۔ کہیں کہیں آسمان دکھائی دیتا تھا اور بس۔

اب علی کو یہ سمجھ آنے لگی تھی کہ آخر یہ پُراسرار شہر اُوپر سے دکھائی کیوں نہیں دیتا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ پہاڑوں میں ڈھکا ہُوا تھا۔ یہاں مکمّل نظم وضبط کے ساتھ زندگی رواں دواں نظر آ رہی تھی۔ ایسی خوبصورت سڑکیں تو اُنھوں نے پرتاب نگر میں بھی نہیں دیکھی تھیں جیسی یہاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ان سڑکوں پر دو جیپیں گھوم رہی تھیں۔ جن میں سوار مسلّح گارڈ کسی فوج کا حصّہ معلوم ہو رہے تھے۔ اُنھوں نے اپنے ہاتھوں میں عجیب وغریب قسم کے پستول تھامے ہُوئے تھے۔ آج تک علی نے ایسے پستول کہیں دیکھے نہیں تھے۔ تینوں رنگوں کے خیموں کی الگ الگ بستیاں بنی ہُوئی تھیں۔ ان خیموں کے مکینوں کے لباس بھی خیموں کے رنگ کے تھے۔ اُنھوں نے دیکھا مختلف خیموں سے مختلف رنگوں کے لباس پہنے ہُوئے لوگ برآمد ہُوئے اور وہ سب ایک طرف چل دیے۔ کیا مجال جو ان میں سے کسی نے آنکھ

اُٹھا کر بھی اِن چاروں کی طرف دیکھا ہو۔

عامر اور علی کی نظریں بڑی ہوشیاری اور بے چینی سے حالات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اُنھوں نے دیکھ لیا تھا کہ خیموں کا شہر پہاڑوں کو کاٹ کر آباد کیا گیا ہے اور پہاڑوں میں باہر نکلنے کے جو دو راستے تھے، اُن پر مسلّح پہرے دار موجود تھے۔ ایک خاص بات سفید رنگ کے خیموں کی تھی۔ یہ خیمے بلندی پر نظر آ رہے تھے۔ ظاہر ہے ان میں پہرے دار ہوں گے۔

وہ لوگ سڑک کے نزدیک کھڑے تھے۔ اُن کے قریب سے پہرے داروں کی ایک جیپ گزری لیکن کسی نے کوئی استفسار نہ کیا۔

"واہ واہ! کیا ڈسپلن ہے" عامر نے حسبِ معمول جھک کر کہا۔

"جہنّم میں جائے سب کچھ۔ آؤ کچھ کھا پی لیں۔ مجھے تو بھوک لگ رہی ہے" کیپٹن علی نے واپس مڑتے ہُوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ خالی پیٹ مرنا تو مجھے بھی پسند نہیں" عامر کے بات کرنے کا انداز ایسا تھا کہ دلیم بھی ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ لوگ اپنے خیمے میں واپس لوٹے۔ اُن کے سامان میں کھانے پینے کی اشیا جوں کی توں دھری تھیں۔ سب نے اُس طرف توجہ کی اور کھانا نکال کر کھانا شروع کر دیا۔

عامر کی گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔ اُس نے ماحول کو خاصا خوش گوار بنا رکھا تھا۔ ولیم حیران تھا کہ موت کے مُنھ میں بیٹھ کر بھی یہ لوگ قہقہے لگا رہے ہیں۔ اس بات نے اُس کا حوصلہ بھی خاصا بلند کر دیا اور جو خوف اُس کے ذہن پر طاری تھا، آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا۔

کمانڈو ایکشن

ابھی ناشتہ اُنھوں نے بمشکل مکمل کیا تھا جب اچانک ایک گڑگڑاہٹ ہوئی۔ آواز کسی مائیکروفون سے آ رہی تھی۔ اُنھوں نے اندازہ لگا لیا کہ یہاں نزدیک ہی یہ ایمپلی فائر چھپائے گئے ہیں۔

"خوش آمدید نئے مہمانو!

اُمید ہے تم نے اپنی نئی دُنیا دیکھ لی ہوگی۔ اب تم اپنی پرانی دُنیا کو بالکل بھول جاؤ کیونکہ وہاں جانے کا تصوّر بھی تمھارے لیے خطرناک ہے۔ تمھیں اس دُنیا کے قانون سے جلد آگاہ کر دیا جائے گا۔ فی الحال تمھارا قیام سُرخ خیموں میں ہے۔ اگر تم ہمارے معیار پر پورے اُترے تو پیلے خیموں میں منتقل کر دیے جاؤ گے۔ اس کے بعد سفید خیموں میں۔ اسی حساب سے تمھیں مشقت بھی کرنی پڑے گی۔ تمھیں بہر صورت ہمارے احکامات اور معیار پر پورا

اترنا ہوگا ورنہ ہم ناکارہ لوگوں کو گولی مار دیا کرتے ہیں۔ کوشش کرنا کہ تم میں سے کوئی بیمار نہ ہو۔ بیمار آدمی کا یہاں واحد علاج موت ہے۔ سفید خیمے پہرے داروں کے ہیں اُن کے نزدیک بھی پھٹکنے کی کوشش نہ کرنا، ورنہ بہت بُری موت مارے جاؤگے۔ یہاں کی موت بڑی سنگین ہوتی ہے۔ آج تمھیں اس کا مظاہرہ بھی دکھا دیا جائے گا"
آواز بند ہوگئی۔

اس کے ساتھ ہی علی نے عامر کو ایک مخصوص اشارہ کیا۔ عامر نے وہی اشارہ ٹیپو کو منتقل کر دیا اور ٹیپو نے ولیم کے کان میں بتا دیا کہ یہاں آواز ریکارڈ کرنے کے آلات چھپائے ہُوئے ہیں، اس لیے گفتگو میں بہت احتیاط کی جائے۔ ولیم نے سمجھتے ہُوئے سر ہلا دیا۔

بمشکل دو منٹ بعد ہی انھیں خیمے کے باہر جیپ رُکنے کی آواز سُنائی دی۔ ایک کرخت آواز نے انھیں باہر آنے کا حکم دیا۔ چاروں باہر نکل آئے۔ جیب میں مسلح پہرے دار موجود تھے۔ اُنھوں نے فوج جیسی وردیاں پہن رکھی تھیں اور تربیت یافتہ فوجی دکھائی دے رہے تھے۔ دو فوجی کُود کر اُن کے خیمے میں داخل ہو گئے۔ اُنھوں نے دیکھتے ہی دیکھتے ان کا سارا سامان خیمے سے نکال کر جیپ میں رکھ دیا۔ پھر

انھیں نئے کپڑے دے دیے گئے۔ اس کے ساتھ ہی انھیں سمجھایا گیا کہ یہاں مختلف اوقات میں مختلف سائرن بجائے جاتے ہیں اور ہر سائرن کا الگ الگ مطلب ہوتا ہے۔ انھیں ہر سائرن کا مطلب سمجھانے کے بعد جیپ واپس چلی گئی۔

اب وہ لوگ سرتاپا سُرخ پوش تھے۔ اُن کے کپڑے، بستر حتیٰ کہ پلاسٹک کے برتن بھی سُرخ رنگ تھے۔

"مجھے تو یہ لباس بہت پسند آیا ہے" عامر نے اپنے لباس پر تنقیدی نظر دوڑاتے ہُوئے کہا۔

"بالکل ٹھیک کہا۔ واقعی تمھارے لیے سُرخ لباس ہی مناسب ہے" علی بولا۔

"کیا مطلب؟ اب ایسی بات بھی نہیں کہ میں کوئی جیل سے بھاگا ہُوا مجرم ہُوں" عامر بولا۔

"یہ بات تو اُن لوگوں کو سمجھاتے جنھوں نے تمھیں مفرور سمجھ کر سُرخ لباس پہنا دیا ہے۔"

"انکل! مجھے تو یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ آخر رانگلے نے براہِ راست آپ سے ملاقات کیوں نہیں کی" ٹیپو نے اُن کی گفتگو میں حصّہ لیتے ہُوئے کہا۔

"بیٹا! دراصل کچھ مجرم نفسیاتی مریض بھی ہوتے ہیں اور انھیں اپنی حیثیت نمایاں کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ یہ

ٹانگو اور وانگلے اسی قسم کے مجرم ہیں۔ وہ ہم پر یہی ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ ان کے نزدیک ہماری حیثیت عام لوگوں کی سی ہے اور بس!"

ابھی اس کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ خیمے سے باہر نکلنے کے سائرن کی مخصوص آواز سنائی دی۔ وہ لوگ بھی باقی لوگوں کی طرح باہر نکل آئے۔ باہر ایک اور ہی منظر دکھائی دیا۔ سڑک کے درمیان ایک سرخ کپڑوں میں ملبوس آدمی کھڑا تھا۔ جس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی تھی۔

لاؤڈ سپیکر پھر شور مچانے لگے۔ ایک آواز بلند ہوئی:

"اس شخص نے کام سے بچنے کے لیے بیماری کا بہانہ کیا تھا۔ اس کو اس جرم کی سزا دی جا رہی ہے۔"

آواز جیسے ہی بند ہوئی۔ اس سے کچھ فاصلے پر کھڑے ایک پہرے دار نے پستول اس کی طرف سیدھا کر دیا۔ یہ اسی طرح کا پستول تھا جو یہاں کے پہرے دار اپنے پاس رکھتے تھے۔ پستول سے گولی کے بجائے ایک شعاع نکلی اور اس مظلوم شخص کے جسم سے ٹکرائی۔

محض چند سیکنڈ میں وہاں ایک زندہ انسان کے بجائے کوئلوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ اسے آواز نکالنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔

عامر کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے زندگی میں ایسا ہولناک مظاہرہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیپٹن علی اس کی پل پل بدلتی کیفیت کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے عامر کی طرف گھور کر دیکھا اور دوسرے ہی لمحے عامر نارمل ہو گیا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ علی نہیں چاہتا تھا کہ ابھی وہ کوئی جذباتی قدم اٹھائے۔

سب لوگ اپنے اپنے خیموں میں واپس آ گئے۔

تھوڑی دیر بعد کام پر جانے کا سائرن بجا اور ایک جیپ ان کے دروازے پر رک گئی۔ چاروں کو الگ الگ سمت میں وہ کام کروانے لے گئے۔ ان لوگوں نے یہاں زمین دوز فیکٹری بنا رکھی تھی جہاں گرفتار شدگان سے مشقت کرواتے تھے۔ انہیں گرفتار ہونے والوں سے پہلے سخت کام لیا جاتا تھا۔ چاروں کو الگ الگ سمت میں سڑکوں کی تعمیر کے لیے لے جایا گیا۔

کیپٹن علی جہاں کام کر رہا تھا۔ وہاں اس کے علاوہ پندرہ بیس اور لوگ بھی موجود تھے۔ ایک مسلح پہرے دار ہاتھ میں چمڑے کا چابک پکڑے ان کے سرہانے موجود تھا۔ اچانک ایک آدمی کو دیکھ کر علی چونک پڑا۔ یہ انسپکٹر روحیل تھا۔ جسے حال ہی میں سرحدی علاقے سے

اغوا کیا گیا تھا۔ اغوا کی ان وارداتوں میں پچھلے تین چار ماہ سے خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ اب علی کو سمجھ آ گئی تھی کہ سرکاری حکام اور مفرور مجرموں کون غائب کر جاتا ہے۔

"روحیل" اُس نے نزدیک پہنچنے پر کام کرتے کرتے روحیل کو مخاطب کیا۔

"سر، آپ!" روحیل نے کن انکھیوں سے اُس طرف دیکھا تو حیران رہ گیا "میرے خیمے کا نمبر دس ہے۔ سُرخ خیمہ۔ یہاں بات کرنا ممکن نہیں۔ موقع ملنے پر پھر بات کریں گے" روحیل نے کہا۔

"تُم بے فکر رہو۔ میں رات کو ملاقات کروں گا" یہ کہہ کر علی اپنے کام میں لگ گیا۔

شام گئے وہ لوگ اپنے خیموں میں واپس لوٹ آئے۔ تینوں کو سڑک بنانے پر لگایا گیا تھا لیکن ٹیپو کو انھوں نے فیکٹری میں صفائی پر مامور کیا تھا۔

"دو آدمی میں نے تیار کر لیے ہیں" عامر نے سرگوشی میں رپورٹ پیش کی۔

"شاباش" علی نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دی۔

O

جب سے روحیل نے کیپٹن علی کو یہاں دیکھا تھا

اُس کے دل نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ اب وہ اِن لوگوں کے چنگل سے رہا ہو جائیں گے۔ وہ بہت بہادر آدمی تھا۔ بڑے بڑے سمگلر اُس کے نام سے ڈر جایا کرتے تھے۔ یہاں اُس کی ملاقات کچھ مفرور مجرموں سے ہوئی تھی جنھیں وہ پہچانتا تھا۔ روحیل نے اُن لوگوں کو فرار کے لیے تیار کر لیا تھا۔ کیونکہ وہ لوگ یہاں زندہ رہنے سے مرجانا بہتر سمجھتے تھے۔ اِن میں ایک پہرے دار بھی شامل تھا جو بعد میں وانگلے کے گروہ میں شامل ہو گیا لیکن اب اُس کی حیثیت ایک قیدی سے زیادہ نہیں تھی۔ اب روحیل کو کسی اچھے وقت کا انتظار تھا کہ قدرت نے کیپٹن علی سے اُس کی ملاقات کرا دی۔

رات کا دوسرا پہر تھا جب اُسے اپنے خیمے کی قنات اُوپر اُٹھتی دکھائی دی اور اس نے کیپٹن علی کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ روحیل اور اُس کے ساتھی حیران رہ گئے یہاں تو چڑیا پر نہیں مار سکتی تھی لیکن علی پہرے داروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر یہاں تک آ گیا تھا۔ روحیل نے اُسے سرگوشیوں میں اپنے ساتھیوں کے متعلق بتایا۔ علی نے انھیں ایک منصوبہ سمجھاتے ہوئے کہا کہ اگر اُنھوں نے ہمت سے کام لیا تو سب نکل جائیں گے ورنہ یہاں ایڑیاں

رگڑ رگڑ کر مرنا ہوگا۔ ان لوگوں کو اپنے منصوبے سے آگاہ کرنے کے بعد مختلف ہدایات دے کر وہ جس طرح چپ چاپ آیا اُسی طرح واپس لوٹ گیا۔

O

ٹیپو نے تیسرے روز انھیں اطلاع دی کہ ان کے خیمے سے بمشکل ایک فرلانگ دُور وانگلے کا ہیڈ کوارٹر ہے، جہاں وہ شیطان ہر وقت اپنے شیطانی تجربات میں مصروف رہتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ یہاں کے پہرے دار دو قسم کی رائفلیں استعمال کرتے تھے۔ ایک تو پستول نما رائفل تھی جس کا مظاہرہ اُنھوں نے دیکھ لیا تھا۔

دُوسری ایک خاص قسم کی رائفل بھی جس کے ایک فائر میں توپ کے گولے جیسی قوت موجود تھی۔ اُس کا شعلہ کسی توپ یا ٹینک کے گولے جیسی طاقت رکھتا تھا۔ دونوں قسم کی رائفلوں میں پانچ گھنٹے تک مسلسل فائرنگ کی صلاحیت موجود تھی۔

کیپٹن علی نے اس دوران منصوبے میں شامل دس آدمیوں سے فرداً فرداً ملاقاتیں کر لی تھیں اور اُن کو مخصوص قسم کے اشارے بھی سمجھا دیے تھے۔ اس کے علاوہ سب کو

بتا دیا گیا تھا کہ انھوں نے وقت آنے پر کیا کیا کرنا ہے۔ اب وہ اُس دن کے منتظر تھے جس روز اُن کے منصوبے میں اُن کے ساتھ شامل پہرے دار کی ڈیوٹی رات کو کسی نزدیکی پوسٹ پر لگتی۔

دسویں روز اُن کی مُراد پوری ہو گئی۔ جب پہرے دار نے علی کو بتایا کہ آج رات اس نے سامنے والی پوسٹ پر ڈیوٹی دینی ہے اور اس کے ساتھ تین اور پہرے دار موجود ہوں گے۔ کیپٹن علی نے اُس رات کو فرار کے لیے منتخب کر لیا۔

O

رات کا وہ دوسرا پہر تھا۔ تھوڑی دیر بعد پہرے داروں کی ڈیوٹیاں تبدیل ہونے والی تھیں، جب ولیم، عامر اور علی اپنے خیمے سے رینگتے ہُوئے باہر نکلے۔ روحیل باہر اُن کا منتظر تھا۔ ٹیپو اس سے پہلے ہی ایک جگہ پہرے داروں پر نظر رکھنے کی ڈیوٹی سنبھال چکا تھا۔ باقی لوگ اپنی اپنی جگہ اشارے کے منتظر تھے۔

تھوڑی دیر بعد علی، عامر اور روحیل قریبی پوسٹ کی طرف رینگنے لگے۔ اُنھوں نے ایسا محفوظ راستہ اختیار کیا تھا جس طرف سے سرچ لائٹ پڑنے کا امکان بھی بہت

کم تھا۔ یہ راستہ بھی اُن کو ان کے منصوبے میں شامل پہرے دار نے بتایا تھا۔ پوسٹ علی کے خیمے سے بمشکل پچاس گز دُور تھی۔

پوسٹ کے نزدیک پہنچ کر علی نے انھیں زمین سے چپک جانے کا اشارہ کیا۔ پھر اُس نے عامر کو ایک سمت اُنگلی سے خاص اشارہ کرتے ہُوئے ہدایات دیں۔ عامر نے سگنل سمجھ لیا تھا۔ وہ رینگتا ہُوا سڑک کے نزدیک آ رہا تھا۔ روحیل اُس کے تعاقب میں تھا۔ جیسے ہی ایک پہرے دار اس طرف آیا۔ عامر اپنی جگہ سے اُچھلا اور اُس نے چیتے کی سی پھُرتی سے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر زمین پر گرا دیا۔ اس سے پہلے کہ پہرے دار کا جسم کوئی حرکت کرے، روحیل نے جو اُسی کے ساتھ ہی موجود تھا، پہرے دار کی گردن پر زوردار ہاتھ مارا اور اُس کی گردن ڈھلک گئی۔

عامر نے پھُرتی سے پہرے دار کی وردی پہن لی اور اُس کی رائفل پر قبضہ کر لیا۔ اب کیپٹن علی ہاتھ اُٹھائے اُس کے آگے آگے چل رہا تھا اور عامر پہرے دار بن کر اُس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ بالکل یُوں لگتا تھا جیسے علی نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی اور قابو آ گیا۔

دونوں کا رُخ دُوسرے پہرے دار کی طرف تھا،

جو اُن کے نزدیک آ رہا تھا۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ اُس کا ساتھی ایک مفرور کو پکڑ کر لا رہا ہے۔

"بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا" عامر نے اُس کے نزدیک پہنچتے ہی اُس کے کچھ پُوچھنے سے پہلے ہی بول دیا۔

"کون پاگل ہے یہ؟" کہہ کر اُس پہرے دار نے نزدیک پہنچ کر علی کا چہرہ دیکھنا چاہا۔

اچانک ہی علی اپنی جگہ سے اُچھلا اور اُس کی زوردار لات پہرے دار کی کنپٹی پر لگی۔ علی نے اُس کے ایسے حصّے پر ضرب لگائی تھی کہ بے چارے کو آواز نکالنے کی مہلت بھی نصیب نہ ہو سکی۔

دونوں نے بے ہوش پہرے دار کو گھسیٹ کر نزدیک کر لیا۔ اب علی بھی پہرے دار کی وردی میں عامر کے ساتھ موجود تھا۔ تیسرے پہرے دار پر قابو پانا ابھی باقی تھا۔ عامر اور علی نے ایک دُوسرے کے تعاقب میں اس کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ اس کے نزدیک پہنچ کر عامر نے آہستہ سے مُنھ سے آواز نکالی۔ جیسے ہی پہرے دار نے گردن گھُمائی علی نے اپنی رائفل کا دستہ پُوری قوت سے اُس کے سر پر مارا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

اس کی وردی اور رائفل پر روحیل نے قبضہ کر لیا۔

چوتھا پہرے دار اُن کا ساتھی ہی تھا۔ اب ایک پوسٹ پر عملاً ان لوگوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ چند منٹ بعد چار اور پہرے داروں نے اُن کی ڈیوٹی سنبھالنے آنا تھا اور اب یہ لوگ نئے شکار کے منتظر تھے۔

نئے پہرے داروں کو اس طرف آتے دیکھ کر سکیم کے مطابق اُس کا ساتھی پہرے دار انھیں چارج دینے کے لیے آگے بڑھا۔ علی، عامر اور روحیل ایک پہاڑی آڑ میں چھپے ہوئے تھے۔ جیسے ہی اُن کے پہرے دار ساتھی نے نئے آنے والوں کو اپنی باتوں میں اُلجھایا۔ تینوں نے اچانک اُن کی پُشت سے نمودار ہو کر اپنے پستول اُن کی گردنوں پر رکھ کر انھیں ہتھیار پھینکنے کا حکم دیا۔

چاروں نئے پہرے دار ابھی صورتِ حال کو جاننے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ اُن کے سروں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ عامر اور علی کی پے در پے ضربات نے چاروں کو زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔

دو تین منٹ میں وہ ان پہرے داروں کو وردیوں اور ہتھیاروں سے بے نیاز کر چکے تھے۔ علی کے اشارے پر عامر اور روحیل نے ان کی وردیاں اور ہتھیار اُٹھائے اور نزدیک ہی چھپے اپنے ساتھیوں تک پہنچا دیے۔ اب

یہاں کے حالات کا کنٹرول عامر کو منتقل ہو چکا تھا۔ اُن لوگوں نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک اور پوسٹ پر قبضہ کر لیا تھا اور علی کے تمام ساتھی پہرے داروں کی وردیوں اور اسلحہ میں ملبوس اُن کی جگہیں سنبھال چکے تھے۔

علی اپنے خیمے کی طرف واپس جا رہا تھا جہاں ٹیپو اس کا منتظر تھا۔ دونوں اب وانگلے کی تجربہ گاہ کی طرف کھسک رہے تھے۔ جلد ہی ٹیپو اُسے ایک محفوظ مقام پر لے آیا۔ اُس نے پچھلے چند روز میں اس عمارت کا مکمل سروے کر کے اندازہ کر لیا تھا کہ یہاں چھپنے کے لیے کون کون سی جگہیں زیادہ مناسب ہیں اور اندر آنے اور باہر جانے کے راستے کون کون سے ہو سکتے ہیں۔

دونوں ایک روشن دان کے نیچے لیٹے ہوئے تھے۔ کمرے میں روشنی سے اُنھوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وانگلے اندر ہی موجود ہے۔ ٹیپو نے علی کو بتایا تھا کہ وانگلے کو ساری رات اسی لیبارٹری میں گزارنے کا خبط ہے۔ اُس نے ٹیپو کو روشن دان کی طرف اشارہ کیا اور خود دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ ٹیپو نے علی کا اشارہ سمجھ لیا تھا اور اب وہ روشن دان پر بندر کی سی پھرتی سے چڑھ گیا تھا۔

روشن دان اتنا بڑا تھا کہ ٹیپو اس میں سے بآسانی اندر داخل ہو سکتا تھا۔ جلد ہی اُس نے اپنا دھڑ اندر کیا۔ ایک ملحقہ کمرے سے وانگلے اس طرف آ گیا۔ اُس کی نظر لاشعوری طور پر روشندان کی طرف ہی گئی تھی جہاں ٹیپو لٹکا ہوا تھا۔

"تم"! وانگلے کے منھ سے بے ساختہ نِکلا۔

ٹیپو اُسے مزید سوچنے کی مہلت نہیں دینا چاہتا تھا۔ اُس نے روشن دان سے جست لگائی اور سیدھا وانگلے پر آ رہا۔ وہ وانگلے کو اپنے ساتھ ہی گھسیٹتا ہُوا دیوار سے لگ گیا تھا۔

علی دروازے سے چپکا کھڑا تھا۔ جب اچانک اُسے اندر دھینگا مشتی کا احساس ہُوا۔ اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر دروازے کو دھکّا دیا اور داخل ہو گیا۔ اسی دوران وانگلے نے ٹیپو کو اپنے اُوپر سے پرے پھینک دیا تھا۔ وہ تھا تو دھان پان سا آدمی لیکن بلا کی طاقت رکھتا تھا۔

کیپٹن علی پر نظر پڑتے ہی وہ بوکھلا گیا۔ لیکن دُوسرے ہی لمحے سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ علی نے پستول اس کی طرف تان رکھا تھا۔

"اوہ تُم! آخر تم مرنے کے لیے خود ہی چلے آئے۔ حالانکہ میں تمھیں کل صبح خود طلب کرنے والا تھا"، وانگلے نے کاٹ کھانے کے انداز میں کہا۔

"میں نے سوچا اِتنے دن ہو گئے، اب ہماری ملاقات ہو ہی جائے تو اچّھا ہے" علی نے برجستہ جواب دیا۔

"تمھاری ساری چالاکی دھری کی دھری رہ جائے گی۔ دیکھو، مجھے مارنے کے بعد بھی تم یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جا سکوگے" وانگلے بولا۔

"دُنیا کے ہر مُجرم کی زبان سے عموماً مرنے سے پہلے یہی الفاظ نِکلا کرتے ہیں۔ وانگلے تمھاری حیثیت ہی کیا ہے۔ مجھے تو تمھارے گورو گھنٹال ٹانگو سے ملاقات کی اُمّید تھی۔ افسوس! اُس نے تمھیں قربانی کا بکرا بنا دیا" علی مسکرایا۔

وہ باتیں کر رہے تھے کہ اچانک وانگلے لڑکھڑا کر گر پڑا۔ بڑا ہوشیار آدمی تھا۔ وہ جان بوجھ کر اپنے بالکل نزدیک لگے ایک پش بٹن پر گرا تھا۔ اس کے ساتھ ہی عمارت زوردار سائرن کی آواز سے گونجنے لگی۔

علی نے ٹیپو کا بازو پکڑ کر اپنی سمت گھسیٹا اور دونوں دروازے سے باہر آ گئے۔ انھوں نے منصوبے کے مطابق دروازے کی طرف آنے والے راستے پر پوزیشنیں سنبھال لی تھیں۔ ٹیپو نے اپنی رائفل جو اس نے روشن دان کے باہر چھپا رکھی تھی اُٹھا لی تھی اور اب وہ لوگ وانگلے کے گارڈز کے منتظر تھے۔

بمشکل ایک منٹ بعد ہی انھوں نے درجنوں گارڈز کو جنھوں نے خاکی رنگ کی فوجیوں جیسی وردیاں پہن رکھی تھیں، کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ جب وہ تمام لوگ اندر داخل ہوگئے تو علی نے خطرناک گن سے ایک فائر کیا۔ ایک شعاع اُس میں سے نکل کر تجربہ گاہ کی طرف لپکی اور زور دار دھماکے کی آواز سے ساری بلڈنگ بھک سے اُڑ گئی۔

وانگلے کی خطرناک ایجاد نے اُس کو اُس کی تجربہ گاہ اور ساتھیوں سمیت راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا تھا۔ دھماکے کی آواز کے ساتھ ہی دوسری طرف لوگ ہوشیار ہو گئے۔ اِس سے پہلے کہ انھیں حالات کی خبر ہوتی، عامر کی کمان میں اُس کے ساتھیوں نے پہرے داروں کے کیمپ پر فائرنگ شروع کر دی۔

یہ رائفلیں اتنی خطرناک تھیں کہ اُن سے نکلنے والی شعاعوں سے پہاڑوں کو بھی آگ لگ جاتی تھی۔ پہاڑوں پر موجود سبزہ جل کر سیاہ ہونے لگا تھا۔ ہر طرف آگ ہی آگ دکھائی دے رہی تھی۔ خیموں میں موجود قیدی بھی باہر نکل آئے تھے۔ یہ لوگ جوشِ انتقام میں دیوانہ وار پہرے داروں کے کیمپ کی طرف بڑھنے لگے۔ اس افراتفری میں کچھ قیدی بھی مارے گئے۔

کیپٹن علی کے ساتھی کیونکہ طے شدہ منصوبے کے مطابق کام کر رہے تھے جبکہ وانگلے کے ساتھی افراتفری کے شکار تھے اور وہ خود مارا جا چکا تھا۔ اس بات سے ان کے حوصلے پست ہوگئے اور جلد ہی انھوں نے ہتھیار ڈال دیے۔

پہرے داروں سے برآمد ہونے والے ایک ٹرانسمیٹر کے ذریعے کیپٹن علی نے نزدیکی فوجی کمان سے رابطہ قائم کیا تھا۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد فوج کے ہیلی کاپٹر اس طرف آگئے۔ ان لوگوں نے اس دوران بڑی مشکل سے قیدیوں پر کنٹرول کیا ہُوا تھا کیونکہ وہ گرفتار ہونے والے پہرے داروں کی تکا بوٹی کرنے پر تُل گئے تھے۔

ان قیدیوں میں مُلکی اور غیر ملکی سائنس دان اور نامی گرامی مجرم شامل تھے۔ یہ سب لوگ لالچ اور پناہ کی تلاش میں ٹانگو کے گروہ کے قابو آگئے تھے۔ جب فوجی حکام یہاں پہنچے تو یہاں صورتِ حال دیکھ کر وہ بھی حیران رہ گئے۔ سب ہی لوگ کیپٹن علی اور اس کے ساتھیوں کی بہادری اور حاضر دماغی پر عش عش کر اُٹھے۔

یہاں سے آزاد ہونے والے سائنس دانوں کے ذریعے ہی انھیں اس بات کا علم ہُوا کہ اُڑن طشتری کا راز کیا تھا۔ دراصل اُس خطرناک کیمیکل کی مدد سے، جو ہیبڑک

سے برآمد ہُوا تھا۔ اِن لوگوں نے انتہائی تباہ کُن جنگی ہتھیار تیار کر لیے تھے۔ اور پیٹرک کو بھی یہ کیمیکل اس لیے بھیجا گیا تھا کہ یہ لوگ اب دارالحکومت میں اسی نوعیت کا خطرناک اسلحہ تیار کر کے تباہ کاری کے ایک بڑے منصوبے پر عمل پیرا ہونے والے تھے۔ علی کی ذہانت اور بہادری سے اُن کے خطرناک عزائم اپنی موت آپ مر گئے۔

سائنس دانوں نے اُس جگہ کی نشان دہی کر دی جہاں سے اس اُڑن طشتری کو کنٹرول کیا جاتا تھا۔ آرمی کے ہیلی کاپٹروں نے سب سے پہلے اس تجربہ گاہ کو بموں سے اُڑا کر رکھ دیا۔ پھر وہ تمام قیدیوں کو باری باری ہیلی کاپٹروں میں لاد کر پرتاب نگر کی چھاؤنی کی طرف روانہ ہو گئے۔

○

"اب کیا ارادے ہیں جناب؟" عامر نے گھر پہنچتے ہی بستر پر ڈھیر ہوتے ہوئے علی سے پُوچھا۔

وہ ولیم کو بھی اپنے ساتھ ہی لے آئے تھے۔ اُس کی ضرورت تو اصل میں اب پیش آنی تھی جب وہ لوگ ٹانگو کے تعاقب میں روانہ ہونے کے لیے پر تول رہے تھے۔

"اصل کھیل تو اب شروع ہُوا ہے۔ ابھی تک تو ٹانگو کے معمولی ایجنٹ ہی میدان میں اُترے ہیں" علی نے بڑی

سنجیدگی سے جواب دیا۔

ولیم نے علی کے چہرے کی طرف دیکھا اور دوبارہ دیکھنے کی ہمت نہ کر سکا۔

"ولیم ہم جلد ہی ٹانگو کے تعاقب میں جا رہے ہیں" علی نے ولیم کی طرف دیکھتے ہوئے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔

"ہاں، اُسے بھی اب مرنا ہی ہو گا۔ ایسے خطرناک درندوں کا زیادہ عرصہ زندہ رہنا ٹھیک نہیں۔ اُس نے انسانیت کو بہت دُکھ پہنچائے ہیں" ولیم بھی سنجیدہ تھا۔

"روانگی سے پہلے میرے خیال سے کھانا کھا لیا جائے۔ یوں بھی خالی پیٹ سفر کرنا ٹھیک نہیں" عامر نے کہا اور سب کھلکھلا کر ہنس دیے۔

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور۔ باہتمام عبدالسلام پرنٹر اور پبلشر

کیپٹن علی، عامر اور ٹیپو سیریز نمبر ۳

دیوتا کی موت

طارق اسمٰعیل ساگر

- دُنیا کا خطرناک مجرم ڈاکٹر ٹانگو اور کیپٹن علی ایک دُوسرے کی گھات میں۔
- دو خوفناک انسانوں کا ٹکراؤ۔ ایک مجرم ایک قانون کا محافظ
- عامر آدم خور جنگلیوں کی قید میں
- ولیم کے کمالات — ٹیپو کی ناقابلِ فراموش بہادری
- سمندروں اور جنگلوں میں موت اور انسان کی خوفناک کشمکش


فیروز سنز لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

حبُّ الوطنی، تحیّر، ایڈونچر اور مزاح سے بھرپور

کیپٹن علی سیریز

نامور ناول نگار جناب طارق اسمٰعیل ساگر کی پاکستانی بچوں کیلئے خصوصی تحریر

اِس سیریز کے دس ناول ہیں

1۔ چکر پہ چکر	2۔ روشنی کا راز
3۔ دیوتا کی موت	4۔ خطرناک بُوڑھا
5۔ خلا کی آفت	6۔ اُلّو کا ہنگامہ
7۔ بلیک میلر	8۔ موت کی پُکار
9۔ کمانڈو اٹیک	10۔ خوں خوار بھیڑیا

کیپٹن علی، ان کے ساتھیوں عامر اور ٹیپو کے شاندار کارناموں کی کہانیاں۔
ہر ناول مکمل کہانی ——— جسے آپ مکمل پڑھے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

فیروزسنز کی خوبصورت اور خاص پیشکش ——— آپ کے لیے



فیروزسنز لمیٹڈ لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

969 0 00906 0

Rs